جلد ۷۹ مارچ ۱۹۷۳ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن

- جلد اوّل : (سورہ الفاتحہ ــــ سورہ الانعام) ~~ہدیہ ۲۱/- روپے~~ زیر طبع
- جلد دوم : (سورہ الاعراف ــــ سورہ بنی اسرائیل) " ۳۰/- "
- جلد سوم : (سورہ الکہف ــــ سورہ الروم) " ۳۳/- ~~۳۲~~ "
- جلد چہارم : (سورہ لقمان ــــ سورہ الاحقاف) " ۲۸/- ~~۲۷~~ "
- جلد پنجم : (سورہ محمدؐ ــــ سورہ الطلاق) تیسرا ایڈیشن زیر طبع
- جلد ششم : (سورہ تحریم ــــ سورہ الناس) دوسرا " "

اِدارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۹	مارچ ۱۹۷۳ء مطابق صفر ۱۳۹۳ھ	عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ لاہور

چندہ سالانہ : دس روپیہ —— فی پرچہ : ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔ پرنٹر۔ محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

یوں تو جماعت اسلامی اپنے مقصد اور طریقِ کار کی کافی حد تک وضاحت کر چکی ہے اور اس ضمن میں کسی مزید صراحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی مگر "منفق سازی" کی حالیہ مہم کے پیشِ نظر بعض حضرات نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ جماعت کا مقصد و منہاج اختصار کے ساتھ پھر عوام کے سامنے لایا جائے، چنانچہ ان کی اس خواہش کی تعمیل میں یہ چند صفحات لکھے جا رہے ہیں۔

دنیا کی کوئی جماعت بھی جب کوئی عزم لے کر اٹھتی ہے تو اس کے بارے میں عام طور پر ذہنوں میں تین سوالات پیدا ہوتے ہیں: وہ جماعت کیا چاہتی ہے؟ کیوں چاہتی ہے؟ اور کس طرح چاہتی ہے؟ یہی تین سوالات فطری طور پر جماعت اسلامی کے بارے میں بھی پوچھے جا سکتے ہیں۔ بنابریں ہم اپنی گزارشات کو صرف ان تین سوالات کے جوابات تک ہی محدود رکھیں گے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ جماعت اسلامی کیا چاہتی ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں جماعتِ اسلامی کی دعوت اور مقصد کیا ہے؟ تو اس کا جواب مختصراً یہ ہے کہ جماعت اِس ضمن میں وہی کچھ چاہتی ہے جو خالق کے ایک بندے کو فرائضِ عبودیت بجا لانے کے لیے کرنا چاہیے، اور جس کی طرف مختلف اوقات میں انبیاء اور صلحائے انسانیت کو متوجہ کرتے رہے ہیں، اور جس پر انسان کی دنیوی فلاح اور اُخروی کامرانی کا دار و مدار ہے۔ یہ نوعِ بشری کی انتہائی بدنصیبی اور بدبختی ہے کہ جس انسان کو خالق نے اپنے بندے کی حیثیت سے پیدا کیا وہ شیطان کی چالبازیوں میں آ کر انسان کا بندہ بننے پر تل گیا۔ جماعت اسلامی مالک الملک کے ارشاد کے مطابق اور ان مقدس نفوس کی پیروی میں جو منشائے خداوندی کو دنیا پر واضح کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، انسانوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں دینے کا عزم رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک انسانیت کی ساری محرومیوں بلکہ اس کی ساری

تیرہ بختیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس خالق نے اسے پیدا کیا اور دنیا میں زندہ رہنے کے لیے اُسے وسائلِ رزق مہیا کیے اُس نے اس کے حقوق کو صحیح طور پر پہچاننے اور انہیں کما حقہٗ ادا کرنے میں مُجرمانہ غفلت برتی اور اس غفلت کی پاداش میں اس پر زندگی اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی۔ اس نے خدا کی غلامی قبول کرنے سے گریز کیا اور قادرِ مطلق نے اسے دنیا میں یہ سزا دی کہ لاتعداد معبودانِ باطل کی غلامی کے قلادے اس کی گردن میں ڈال دیئے۔ گُم کردہ راہ انسان نے مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں نیاز مندی کا شیوہ اختیار کرنے کے بجائے سرکشی کی روش اختیار کی تو اس کی فطرت اس قدر مسخ ہو گئی کہ وہ جھوٹے بُتوں کے آستانوں پر پُورے جذبۂ عبودیت کے ساتھ جھکنے لگا۔ اُس نے کبھی پتھر کے بُتوں کی پرستش کی تو کبھی آسمانی ستاروں کی کبھی زندہ انسانوں کی عبادات کی تو کبھی گذرے ہوئے بزرگوں کی، کبھی قومیت اور وطنیت کے بُتوں کی پرستش کی اور کبھی سیاسی اور معاشی مفادات کی قربان گاہ پر اپنے ضمیر اور ایمان حتیٰ کہ اپنی شخصیت تک کی قربانی پیش کر دی۔ بندہ زعمِ باطل میں گرفتار ہو کر خواہ اپنے مرتبہ اور مقام کے بارے میں جو چاہے کہتا پھرے لیکن وہ اپنے فطری احساس یعنی احساسِ عبودیت سے کبھی عاری نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر خدا کی بندگی سے انحراف کرتا ہے تو شیطان کی بندگی پر مجبور ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا قلب و دماغ جذبۂ بندگی سے ہمیشہ معمور رہتا ہے۔ اُسے اس دنیا میں بہر حال بندہ بن کر ہی رہنا ہے خواہ وہ مالکِ حقیقی کا بندہ بن کر دنیا اور آخرت میں فائز المرام ہو یا کسی جھوٹے خدا کا یا خود اپنے نفس کا بندہ بن کر دُنیا اور عقبیٰ میں ناکام و نامراد ہو۔ سروری صرف اُسی ذاتِ بے ہمتا کو زیب دیتی ہے جو اس کائنات کا خالق، مالک اور مُدبّر ہے۔ خدائی کے دوسرے سارے دعویدار بُتانِ آذری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خواہ یہ بُت مٹی اور پتھر کے مجسّموں کی صورت میں بُت پرست قوموں کے معابد میں نصب ہوں یا "انسانی خداؤں" کے روپ میں تختِ اقتدار پر متمکن ہوں۔

اِس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ "بندے کی خدائی" کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ بندہ لازمی طور پر فرعون اور نمرود کی طرح اپنی زبان سے دعوائے خدائی کا باقاعدہ اعلان کرے اور عوام سے اپنی بارگاہ میں سجدہ ریز ہونے کا تقاضا کرے۔ بلکہ "بندے کی خدائی" کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کائنات کے حقیقی حاکم کی حاکمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے عوام پر اپنی حاکمیت مسلط کرنے کی کوشش کرے۔ یہ کائنات جب اس خالق کی تخلیق ہے جسے ربّ کہا جاتا ہے تو اس پر حکم بھی اسی کا چلنا چاہیے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پُورا نظامِ طبیعی

خالقِ حقیقی کے ضابطوں کا بڑی سختی سے پابند ہے اور اُن سے سرِ مُو انحراف نہیں کرتا۔ انسان بھی اپنی زندگی کے طبیعی دائرے میں انہی ضابطوں کی پابندی کرنے پر مجبور ہے۔ مگر جب وہ اِس دائرے سے نکل کر ارادہ و اختیار کی آزاد فضا میں داخل ہوتا ہے تو وہاں وہ اپنے اصل مقام یعنی مقامِ بندگی کو قبول کر مقامِ کبریائی کا دعویدار بن جاتا ہے اور یہی اِس دنیا میں ظلم و فساد کی اصل وجہ ہے۔ اگر انسان اِس دائرے میں بھی احکامِ الٰہی کی پابندی کرے تو نہ صرف اُس کی داخلی زندگی ہر قسم کے تناقض سے پاک ہو جائے بلکہ اس کی خارجی زندگی بھی مکمل ہم آہنگی پیدا ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے انتشار سے محفوظ رہے۔ اور اس طرح یہ کرۂ ارض فتنہ و فساد کی آماجگاہ بننے کے بجائے صلح و آشتی کا گہوارہ بن جائے۔ اِس حقیقت کی طرف قرآن مجید نے انسان کو بار بار متوجہ کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاۗءَ بِنَاۗءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرۃ: ۲۲)

لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا۔ آسمان کی چھت بنائی اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ ٹھہراؤ۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۱۷)

تم اللہ کے سوا جنہیں پوج رہے ہو وہ تو محض بت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو، دراصل اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے پس اللہ کے ہاں سے رزق مانگو اور اس کی عبادت کرو اور اللہ کا شکر کرو اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

قرآن مجید میں یوں تو اس موضوع کی بیسیوں آیات موجود ہیں مگر یہ دو اس امر کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ معبودِ حقیقی وہی ذات ہے جس نے انسان اور ساری کائنات کی تخلیق کی ہے۔ اور انسان اور دوسری جاندار

مخلوقات کو وسائلِ رزق مہیا کیے ہیں۔ نہ تو اس کی تخلیق میں اس کا کوئی ثانی ہے اور نہ اس کی صفتِ ربوبیت میں اس کا کوئی شریک و سہیم ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو انسان کے لیے معقولیت کی راہ یہی ہے کہ وہ زندگی کے اس محدود دائرے میں بھی جس میں خود خالق نے اسے ارادہ و اختیار بخشا ہے صرف خدا کا بندہ بن کر رہے اور جھوٹے خداؤں کی غلامی کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اپنے بلیغانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے:

فَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ۭ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۝ (الحج: ۳۴)

پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے تو تم اسی کے فرمانبردار بنو اور خوشخبری دیجیے اُن لوگوں کو جو خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ جماعت اسلامی فکر و عمل کی یہ بنیادی تبدیلی کیوں چاہتی ہے تو اس کا جواب محولہ بالا آیات میں موجود ہے۔ وہ خدا کی بندگی کی طرف انسانوں کو اس لیے دعوت دیتی ہے کہ بحیثیتِ مخلوق یہ ہمارا اوّلین فرض ہے اور اس فرض کو بجا لانے میں اگر ہم غفلت کا مظاہرہ کریں تو گویا جادۂ مستقیم سے ہٹ کر اپنے لیے اور بنی نوعِ انسان کے لیے تباہی کا سامان فراہم کریں گے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (یونس: ۳۵)

ان سے کہیے تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی راہ دکھاتا ہو؟ آپ کہیے اللہ ہی حق کی راہ دکھاتا ہے پھر بتاؤ جو حق کی راہ دکھائے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود ہی راہ نہ پاتا ہو جب تک اُسے سجھائی نہ جائے آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے فیصلے کرتے ہو؟

کوئی فرد خواہ وہ کتنا ہی ذہین و فطین ہو یا اصحابِ بصیرت کا کوئی عظیم گروہ خواہ وہ دل و دماغ کی کیسی ہی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہو یا پُوری نسلِ انسانی فکر و نظر کے سارے سرمائے کو مجتمع کر کے بھی اگر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے لیے رشد و ہدایت کا کوئی جامع ضابطہ مرتب کرنے کی کوشش کرے تو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضابطۂ حیات کی تدوین وہی ذات کر سکتی ہے جو

اپنی مخلوق کے عناصرِ ترکیبی اور ان کے مزاج اور عمل سے کماحقہٗ واقفیت رکھتی ہو۔ چنانچہ خالقِ کائنات کے علاوہ کوئی دوسری ہستی یا ادارہ اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ اِس لیے انسان کی فلاح و کامرانی کا راز اسی بات میں مُضمر ہے کہ اُس کے دیتے ہوئے ضابطۂ حیات کی پابندی کی جائے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؁ (الاعراف: ۳)

لوگو! اُس کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری طرف نازل ہوا ہے اور اس کو چھوڑ کر دوسرے (من گھڑت) سرپرستوں کی پیروی نہ کرو مگر تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔

جماعت اسلامی بنی نوعِ انسان کی طرف کوئی نیا پیغام لے کر نہیں آئی بلکہ اُسی دعوت الی الخیر کو پھیلانے کے لیے اُٹھی ہے جو ہر زمانے اور ہر عہد میں بندگانِ خدا پھیلاتے رہے ہیں۔ اور جسے امتِ مُسلمہ کا حقیقی منصب قرار دیا گیا ہے۔

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (آل عمران: ۱۱۰)

تم وہ بہترین اُمت ہو جو سارے انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر کامل ایمان رکھتے ہو۔

اس فرض کو سرانجام دینے کے لیے جماعت اسلامی اپنے محدود وسائل کے ساتھ خود بھی کوشاں ہے اور اُمتِ مُسلمہ کو بھی —— جو کافی حد تک اپنے اس فرض سے غافل ہو چکی ہے —— یہ فرض یاد دلاتی ہے اور اسے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہی ہے کہ نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے کا کام محض وعظ و نصیحت اور اِنذار و تبشیر سے پُورا نہیں ہوتا بلکہ اسے جو نیکی کا حکم دینے والا بنایا گیا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ وعظ و نصیحت کے علاوہ ایسی طاقت بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے جس سے نیکی کو پروان چڑھایا اور بُرائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جا سکے۔ جماعت اسلامی کے جس موقف اور اس کی جس جدوجہد کو اس کے مخالفین "سیاست بازی" اور ہوسِ اقتدار کا طعنہ دیتے ہیں وہ درحقیقت نہ تو سیاست بازی ہے اور نہ ہوسِ اقتدار بلکہ خالص خدا پرستی اور خالق کی رضا جوئی کے لیے مقدس جدوجہد ہے۔ کیونکہ اس جدوجہد کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے دین کو ادیانِ باطل پر غالب کر دیا جائے اور یہی وہ فرض ہے جس کی انجام دہی

کا اللہ تعالیٰ نے امّتِ مسلمہ کو پابند کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ؁ (التوبہ: ۳۳)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو حقیقی ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو وہ تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار گزرے۔

یعنی آخری رسول کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلام ایک غالب قوت کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں بھی آتا ہے اَلْاِسْلَامُ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى ''اسلام سربلندی اور بالادستی چاہتا ہے مغلوبیت نہیں''۔ پس یہ ضروری ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں خدا ہی کا دین قائم اور نافذ ہو کیونکہ جب تک حیاتِ انسانی کا کوئی ایک پہلو اور نسلِ انسانی کا کوئی ایک حصّہ بھی دائرۂ دین سے خارج رہتا ہے اس وقت تک نہ باطل ادیان کی عملداری ختم ہوتی ہے اور نہ دینِ حق کو حقیقی سربلندی نصیب ہو سکتی ہے۔ اور یہ چیز سیاسی اقتدار کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر سیاسی اقتدار کی خواہش کوئی مذموم خواہش ہوتی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ یہ دعا کرنے کی کبھی تلقین نہ فرماتا: وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ''اور اے نبی! دعا کرو، پروردگار مجھے جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنے پاس سے کسی قوت و اقتدار کو میرا مددگار بنا دے''۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ حق و صداقت میں خود ایک غیر معمولی قوت اور کشش ہوتی ہے اور ان کا نور سلیم الفطرت انسانوں میں خود بخود پھیلتا چلا جاتا ہے۔ بلکہ سلیم الفطرت انسان خود اس نور کی تلاش میں رہتے ہیں اور جہاں اس کی ایک جھلک بھی انہیں نظر آتی ہے وہ اس کی طرف فوراً لپکتے ہیں اور نورِ ہدایت کو نہ صرف اپنے سینوں میں اتارتے ہیں بلکہ اس سے اپنی پوری زندگی کو منوّر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس سے پوری دنیا میں حق و صداقت کا بول بالا ہو جائے۔ کیونکہ دنیا میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے سیاہ باطن لوگوں کی بھی رہی ہے جو دینِ حق کی راہ میں ہمیشہ مزاحم رہے ہیں۔ اُن کی مزاحمت اُس صورت میں ختم ہو سکتی ہے جب اللہ کا دین پوری طرح غالب ہو کر باطل کی قوت کو یکسر توڑ کر رکھ دے۔ اس مقدس جدوجہد کو قرآنِ مجید نے فریضۂ اقامتِ دین کا نام دیا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے جماعت اسلامی سرگرمِ عمل ہے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کی دعوت دیتی ہے۔

جہاں تک تیسرے سوال کا تعلق ہے کہ جماعت اسلامی اس فریضۂ اقامتِ دین کو کس طرح سرانجام دینا چاہتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس فرض کو اپنی حد تک اسی انداز سے بجالانے کی کوشش کر رہی ہے جو انبیاء علیہم السّلام نے اپنے اپنے عہد میں اختیار کیا اور جس کے بارے میں ہمیں قرآن و سنت سے واضح ہدایت اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ یعنی سب سے پہلے اسلام کی دعوت کو عام کیا جائے اور خاص طور پر مسلمانوں کے اندر فکر و عمل کی جو کوتاہیاں پائی جاتی ہیں انہیں دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ اس کام کو دعوتِ دین، تطہیرِ افکار اور تعمیرِ اخلاق کا کام کہہ سکتے ہیں۔ پھر جو لوگ اقامتِ دین کی مقدس جدوجہد میں عملاً شریک ہونا چاہیں انہیں ایک جماعت کی صورت میں منظم کیا جائے اور پھر اس تنظیم سے اعلائے کلمۃ اللہ کا کام لیا جائے کیونکہ اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے کام سے زیادہ کسی بہتر کام کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا اور جو کوشش بھی اس راہ میں کی جائے اُس سے زیادہ مقدس کوئی دوسری کوشش نہیں ہو سکتی۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (حٰمٓ سجدہ: ۳۳)

اور اس شخص سے زیادہ بھلی بات کہنے والا اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف دعوت دے اور خود بھی نیک کام کرے اور یہ بلا کہے کہ میرا تعلق ان لوگوں سے ہے جو خدا کے فرمانبردار ہیں۔

اُمتِ مُسلِمہ جس پر اِس دنیا میں شہادتِ حق کی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے وہ اگر دعوتِ حق کا فرض انجام دینے میں کوتاہی کرے تو اور کس سے اس نیک کام کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اگر پوری امت دین کے معاملے میں غفلت کا شکار ہے تو کم از کم وہ لوگ تو آگے بڑھ کر اس کام کو سرانجام دیں جو اپنی دینی ذمہ داریوں کو پہچانتے ہیں۔ اور حالات کی تمام سنگینیوں کے باوجود اللہ کے دین کو غالب کرنے کے آرزومند ہیں۔

جماعت اسلامی کا مقصد جس قدر پاکیزہ اور مقدس ہے اسی طرح اس کے کام کرنے کا طریق اور جدوجہد کا راستہ بھی فتنہ و فساد اور اسی نوعیت کی دوسری تخریبی سرگرمیوں سے یکسر پاک ہے۔ وہ اپنے کام کو تشدد اور زیرِ زمین کارروائیوں کی مدد سے آگے نہیں بڑھانا چاہتی بلکہ افہام و تفہیم اور رائے عام کو ہموار کر کے اپنی دعوت کے دائرے کو وسعت دینا چاہتی ہے۔ وہ اس بات پر پختہ یقین رکھتی ہے کہ (باقی صفحہ ۷۴ پر)

تفہیم القرآن

مُعَوِّذَتَین

الفَلَق ـــــــــ النّاس

نام اگرچہ قرآن مجید کی یہ آخری دو سورتیں بجائے خود الگ الگ ہیں، اور مُصحف میں الگ ناموں ہی سے لکھی ہوئی ہیں، لیکن ان کے درمیان باہم اتنا گہرا تعلق ہے، اور ان کے مضامین ایک دوسرے سے اتنی قریبی مناسبت رکھتے ہیں کہ ان کا ایک مشترک نام "مُعَوِّذَتَین" (پناہ مانگنے والی دو سورتیں) رکھا گیا ہے۔ امام بیہقی نے دلائلِ نبوۃ میں لکھا ہے کہ یہ نازل بھی ایک ساتھ ہی ہوئی ہیں، اسی وجہ سے دونوں کا مجموعی نام مُعَوِّذَتَین ہے۔ ہم یہاں دونوں پر ایک ہی دیباچہ لکھ رہے ہیں کیونکہ ان سے متعلقہ مسائل و مباحث بالکل یکساں ہیں۔ البتہ آگے ان کی ترجمانی و تفسیر الگ الگ کی جائے گی۔

زمانۂ نزول حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطاء اور جابر بن زید کہتے ہیں کہ یہ سورتیں مکی ہیں [illegible] ابن عباس سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ مگر ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مدنی ہے اور یہی قول حضرت عبداللہ بن زبیر اور قتادہ کا بھی ہے۔ اس دوسرے قول کو جو روایات تقویت پہنچاتی ہیں ان میں سے ایک مُسلم، ترمذی، نسائی اور مُسند احمد بن حنبل میں حضرت عُقبہ بن عامر کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز مجھ سے فرمایا: الم تر ایات اُنزِلت اللیلۃ لم یُرَ مثلھن، اعوذ برب الفلق، اعوذ برب الناس "تمہیں کچھ پتہ ہے کہ آج رات مجھ پر کیسی آیات نازل ہوئی ہیں؟ یہ بے مثل آیات ہیں، اعوذ برب الفلق اور اعوذ برب الناس"۔ یہ حدیث اِس بنا پر ان سورتوں کے مدنی ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عُقبہ بن عامر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ایمان لائے تھے، جیسا کہ ابوداؤد اور نسائی نے خود ان کے اپنے بیان سے نقل کیا ہے۔ دوسری روایات جو اس قول کی تقویت کی موجب بنتی ہیں وہ ابن سعد، محیُ السنۃ بَغوی، امام نسفی، امام بیہقی، حافظ ابن حجر، حافظ بدرالدین عینی، عبد بن حمید وغیرہم کی

نقل کردہ یہ روایات ہیں کہ جب مدینہ میں یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور اس کے اثر سے حضورؐ بیمار ہو گئے تھے اُس وقت یہ سورتیں نازل ہوئی تھیں۔ ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہ ۷ھ کا واقعہ ہے۔ اِسی بنا پر سُفیان بن عُیَینہ نے بھی اِن سُورتوں کو مدنی کہا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم سورۂ اخلاص کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، کسی سُورۃ یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب لازماً یہی نہیں ہوتا کہ وہ پہلی مرتبہ اُسی موقع پر نازل ہوئی تھی، بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک سُورت یا آیت پہلے نازل ہو چکی ہوتی تھی، اور پھر کوئی خاص واقعہ یا صورتِ حال پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسی کی طرف دوبارہ بلکہ کبھی کبھی بار بار حضورؐ کو توجہ دلائی جاتی تھی۔ ہمارے نزدیک ایسا ہی معاملہ مُعوّذتین کا بھی ہے۔ اِن کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ ابتداءً مکہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہوں گی جب وہاں حضور کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔ بعد میں جب مدینہ طیبہ میں منافقین، یہود، اور مشرکین کی مخالفت کے طوفان اُٹھے تو حضورؐ کو پھر انہی دونوں سُورتوں کے پڑھنے کی تلقین کی گئی جیسا کہ حضرت عُقبہ بن عامر کی مندرجۂ بالا روایت میں ذکر آیا ہے اس کے بعد جب آپ پر جادو کیا گیا اور آپ کی علالتِ مزاج نے شدت اختیار کی تو اللہ کے حکم سے جبریل علیہ السلام نے آکر پھر یہی سورتیں پڑھنے کی آپ کو ہدایت کی۔ اس لیے ہمارے نزدیک اُن مفسّرین کا بیان ہی زیادہ معتبر ہے جو اِن دونوں سُورتوں کو مکّی قرار دیتے ہیں۔ جادو کے معاملہ کے ساتھ اِن کو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھی مانع ہے کہ اُس کے ساتھ صرف سورۂ فلق کی صرف ایک آیت وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ہی تعلق رکھتی ہے، سُورۂ فلق کی باقی آیات اور پُوری سورۂ ناس کا اِس معاملہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

موضوع اور مضمون مکہ معظمہ میں یہ دونوں سُورتیں جن حالات میں نازل ہوئی تھیں وہ یہ تھے کہ اسلام کی دعوت شروع ہوتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ جُوں جُوں آپ کی دعوت پھیلتی گئی، کفّارِ قریش کی مخالفت بھی شدید ہوتی چلی گئی۔ جب تک اُنہیں یہ امید رہی کہ شاید وہ کسی طرح کی سودے بازی کر کے، یا بہلا پھسلا کر آپ کو اِس کام سے باز رکھ سکیں گے، اُس وقت تک تو پھر بھی عناد کی شدّت میں کچھ کمی رہی۔ لیکن جب حضورؐ نے اُن کو اِس طرف سے بالکل مایُوس کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت کرنے

پر آمادہ ہوسکیں گے، اور سورۂ کافرون میں صاف صاف ان سے کہہ دیا گیا کہ جن کی بندگی تم کرتے ہو اُن کی بندگی کرنے والا میں نہیں ہوں، اور جس کی بندگی میں کرتا ہوں اس کی بندگی کرنے والے تم نہیں ہو، اس لیے میرا راستہ الگ ہے اور تمہارا راستہ الگ، تو کفار کی دشمنی اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی۔ خصوصیت کے ساتھ جن خاندانوں کے افراد (مردوں یا عورتوں، لڑکوں یا لڑکیوں) نے اسلام قبول کر لیا تھا ان کے دلوں میں تو حضورؐ کے خلاف ہر وقت بھٹیاں سلگتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آپ کو کوسا جا رہا تھا۔ خفیہ مشورے کیے جا رہے تھے کہ کسی وقت رات کو چھپ کر آپ کو قتل کر دیا جائے تاکہ بنی ہاشم کو قاتل کا پتہ نہ چل سکے اور وہ بدلہ نہ لے سکیں۔ آپ کے خلاف جادو ٹونے کیے جا رہے تھے تاکہ آپ یا تو وفات پا جائیں یا سخت بیمار پڑ جائیں، یا دیوانے ہو جائیں۔ شیاطینِ جن و انس ہر طرف پھیل گئے تھے تاکہ عوام کے دلوں میں آپ کے خلاف اور آپ کے لائے ہوئے دین اور قرآن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیں جس سے لوگ بدگمان ہو کر آپ سے دور بھاگنے لگیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھی جل رہی تھی، کیونکہ وہ اپنے سوا، یا اپنے قبیلے کے کسی آدمی کے سوا، دوسرے کسی شخص کا چراغ جلتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ابوجہل جس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں حد سے بڑھتا چلا جاتا تھا اس کی وجہ وہ خود یہ بیان کرتا ہے کہ "ہمارا اور بنی عبد مناف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) کا باہم مقابلہ تھا۔ اُنہوں نے کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے۔ اُنہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی دیں۔ انہوں نے عطیے دیئے تو ہم نے بھی دیئے۔ یہاں تک کہ وہ اور ہم جب عزت و شرف میں برابر کی ٹکر ہو گئے تو اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس پر آسمان سے وحی اترتی ہے۔ بھلا اس میدان میں ہم کیسے اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ خدا کی قسم ہم ہرگز اس کو نہ مانیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے" (ابن ہشام، جلد اوّل، ص ۳۳۷-۳۳۸)

اِن حالات میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ اِن لوگوں سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں طلوعِ صبح کے رب کی، تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے اور جادوگروں اور جادوگرنیوں کے شر سے، اور حاسدوں کے شر سے۔ اور ان سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبود کی ہر اُس وسوسہ انداز کے شر سے جو بار بار پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ شیاطینِ جن میں سے ہو یا شیاطینِ انس میں سے۔

یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی حضرت موسیٰ نے اُس وقت فرمائی تھی جب فرعون نے بھرے دربار میں اُن کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ "میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے ہر اُس متکبر کے مقابلے میں جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا" (المؤمن، ۲۷)۔ وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ، "اور میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے اِس بات سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو" (الدُّخان - ۲۰)

دونوں مواقع پر اللہ کے اِن جلیل القدر پیغمبروں کا مقابلہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں بڑے سروسامان اور وسائل و ذرائع اور قوت و شوکت رکھنے والوں سے تھا۔ دونوں مواقع پر وہ طاقتور دشمنوں کے آگے اپنی دعوتِ حق پر ڈٹ گئے درآنحالیکہ ان کے پاس کوئی مادی طاقت ایسی نہ تھی جس کے بل پر وہ ان کا مقابلہ کر سکتے۔ اور دونوں مواقع پر انہوں نے دشمنوں کی دھمکیوں اور خطرناک تدبیروں اور معاندانہ چالوں کو یہ کہہ کر نظرانداز کر دیا کہ تمہارے مقابلے میں ہم نے ربِّ کائنات کی پناہ لے لی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اولوالعزمی اور ثابت قدمی وہی شخص دکھا سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اُس کے رب کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، اُس کے مقابلے میں دنیا کی ساری طاقتیں ہیچ ہیں، اور اس کی پناہ جسے حاصل ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کلمۂ حق کے اعلان سے ہرگز نہیں ہٹوں گا، تم جو چاہو کر لو، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ میں تمہارے اور اپنے اور ساری کائنات کے رب کی پناہ لے چکا ہوں۔

مُعوِّذتین کی قرآنیت ان دونوں سُورتوں کے موضوع اور مضمون کو سمجھنے کے لیے تو اتنی بحث ہی کافی ہے جو اُوپر کی جا چکی ہے۔ لیکن چونکہ حدیث و تفسیر کی کتابوں میں اِن کے متعلق تین ایسے مباحث آ گئے ہیں جو دلوں میں شبہات پیدا کر سکتے ہیں، اس لیے ہم ان کو بھی صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ان میں سے اوّلین قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا اِن دونوں سُورتوں کا قرآنی سُورتیں ہونا قطعی طور پر ثابت ہے، یا اس میں کسی شک کی گنجائش ہے؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے عظیم المرتبہ صحابی سے متعدد روایتوں میں یہ بات منقول ہوئی ہے کہ وہ اِن دونوں سُورتوں کو قرآن کی سُورتیں نہیں مانتے تھے اور اپنے مُصحف سے انہوں نے اِن کو ساقط کر دیا تھا۔ امام احمد، بزّار، طَبرانی، ابن مَردُویہ، ابویَعلیٰ، عبداللہ بن احمد بن حنبل، حُمیدی، اَبُونعیم،

ابن حبان، وغیرہ محدثین نے مختلف سندوں سے، اور اکثر و بیشتر صحیح سندوں سے یہ بات حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کی ہے۔ اِن روایات میں نہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ اِن سُورتوں کو مُصحف سے ساقط کر دیتے تھے، بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے "قرآن کے ساتھ وہ چیزیں نہ ملاؤ جو قرآن کا جُز نہیں ہیں۔ یہ دونوں قرآن میں شامل نہیں ہیں۔ یہ تو ایک حکم تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپ اِن الفاظ میں خدا کی پناہ مانگیں" بعض روایات میں اس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ وہ اِن سُورتوں کو نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔

اِن روایات کی بنا پر مخالفینِ اسلام کو قرآن کے بارے میں یہ شُبہات اُبھارنے کا موقع مل گیا کہ معاذ اللہ یہ کتاب تحریف سے محفوظ نہیں ہے بلکہ اِس میں جب یہ دو سُورتیں ابنِ مسعودؓ جیسے صحابی کے بیان کے مطابق الحاقی ہیں تو نہ معلوم اور کیا کیا حذف و اضافے اس کے اندر ہوئے ہونگے۔ اِس طعن سے پیچھا چھڑانے کے لیے قاضی ابوبکر الباقِلّانی اور قاضی عیاض وغیرہ نے یہ تاویل کی کہ ابنِ مسعودؓ معوّذتین کی قرآنیت کے منکر نہ تھے بلکہ صرف ان کو مُصحف میں درج کرنے سے انکار کرتے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک مُصحف میں صرف وہی چیز درج کی جانی چاہیے تھی جس کے ثبت کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہو، اور ابن مسعودؓ تک یہ اطلاع نہیں پہنچی تھی کہ حضورؐ نے اس کی اجازت دی ہے لیکن یہ تاویل درست نہیں ہے، کیونکہ صحیح سندوں کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے اِن کے قرآنی سُورتیں ہونے کا انکار کیا ہے۔ کچھ دوسرے بزرگوں مثلاً امام نوَوِی، امام ابنِ حزم اور امام فخرالدین رازی نے سرے سے اس بات ہی کو جھوٹ اور باطل قرار دیا ہے کہ ابن مسعودؓ نے ایسی کوئی بات کہی ہے۔ مگر مستند تاریخی حقائق کو بلا سند رد کر دینا کوئی علمی طریقہ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ابنِ مسعودؓ کی اِن روایات سے قرآن پر جو طعن وارد ہوتا ہے اس کا صحیح رد کیا ہے؟ اِس سوال کے کئی جواب ہیں جن کو ہم سلسلہ وار درج کرتے ہیں:

(۱) حافظ بزّار نے اپنی مُسند میں ابن مسعودؓ کی یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اپنی اِس رائے میں وہ بالکل منفرد ہیں۔ صحابہ میں سے کسی نے بھی اُن کے اِس قول کی تائید نہیں کی ہے۔

(۲) تمام صحابہ کے اتفاق سے خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے جو

نسخے مرتب کروائے تھے اور خلافتِ اسلامیہ کی طرف سے جن کو دنیائے اسلام کے مراکز میں سرکاری طور پر بھیجا گیا تھا، اُن میں یہ دونوں سورتیں درج تھیں۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک تمام دنیائے اسلام کا جس مُصحف پر اجماع ہے اُس میں یہ دونوں سُورتیں درج ہیں۔ تنہا عبداللہ بن مسعودؓ کی رائے، اُن کی جلالت قدر کے باوجود، اِس عظیم اجماع کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت صحیح و معتبر احادیث کے مطابق یہ ثابت ہے کہ آپ نے ان سُورتوں کو نماز میں خود پڑھا ہے، دوسروں کو پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اور قرآن کی سُورتوں کی حیثیت ہی سے لوگوں کو ان کی تعلیم دی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی احادیث ملاحظہ ہوں:

مسلم، احمد، ترمذی، اور نسائی کے حوالہ سے حضرت عُقبہؓ بن عامر کی یہ روایت ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ حضورؐ نے سورۂ فلق اور سورۂ ناس کے متعلق اُن سے یہ فرمایا کہ آج رات یہ آیات مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ نسائی کی ایک روایت عقبہ بن عامر سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں سورتیں صبح کی نماز میں پڑھیں۔ ابنِ حبان نے انہی حضرت عُقبہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے اُن سے فرمایا "اگر ممکن ہو تو تمہاری نمازوں سے اِن دونوں سُورتوں کی قراءت چھوٹنے نہ پائے"۔ سعید بن منصور نے حضرت مُعاذ بن جَبل سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صبح کی نماز میں یہ دونوں سُورتیں پڑھیں۔ امام احمد اپنی مُسند میں صحیح سند کے ساتھ ایک اور صحابی کی یہ روایت لائے ہیں کہ حضورؐ نے ان سے فرمایا جب تم نماز پڑھو تو اس میں یہ دونوں سُورتیں پڑھا کرو۔ مُسند احمد، ابوداؤد، اور نسائی میں عُقبہ بن عامر کی یہ روایت آئی ہے کہ حضورؐ نے اُن سے فرمایا "کیا میں دو ایسی سُورتیں تمہیں نہ سکھاؤں جو اُن بہترین سُورتوں میں سے ہیں جنہیں لوگ پڑھتے ہیں؟" انہوں نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ۔ اس پر حضورؐ نے ان کو یہی مُعوّذتین پڑھائیں۔ پھر نماز کھڑی ہوئی تو حضورؐ نے یہی دو سُورتیں اس میں بھی پڑھیں۔ اور نماز کے بعد پلٹ کر جب آپ اُن کے پاس سے گزرے تو فرمایا "اے عُقب، کیسا پایا تم نے؟" اور اس کے بعد اُن کو ہدایت فرمائی کہ جب تم سونے لگو اور جب سو کر اُٹھو تو ان سُورتوں کو پڑھا کرو۔ مُسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی

میں عُقبہ بن عامر کی ایک اور روایت یہ ہے کہ حضورؐ نے ان کو ہر نماز کے بعد مُعوِّذات (یعنی قُل ہو اللہ احد اور مُعوِّذتین) پڑھنے کی تلقین کی۔ نسائی، ابنِ مَردُویہ اور حاکم نے عُقبہ بن عامر کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضور سواری پر چلے جا رہے تھے اور مَیں آپ کے قدمِ مبارک پر ہاتھ رکھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مَیں نے عرض کیا مجھے سُورۂ ہود یا سُورۂ یوسف سکھا دیجیے۔ فرمایا "اللہ کے نزدیک بندے کے لیے قُل اَعُوذُ بربّ الفلق سے زیادہ نافع کوئی چیز نہیں ہے"۔ عبداللہ بن عابس الجُہنی کی روایت نسائی، بیہقی، بغوی اور ابن سعد نے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا "ابن عابس کیا مَیں تمہیں نہ بتاؤں کہ پناہ مانگنے والوں نے جتنی چیزوں کے ذریعہ سے اللہ کی پناہ مانگی ہے ان میں سب سے افضل کون سی چیزیں ہیں؟" مَیں نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ۔ فرمایا "قُل اَعُوذُ بربّ الفلق اور قُل اَعُوذُ بربّ الناس، یہ دونوں سورتیں"۔ ابن مَردُویہ نے حضرت اُمّ سلمہ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ کو جو سُورتیں سب سے زیادہ پسند ہیں وہ قُل اعوذ بربّ الفلق اور قُل اعوذ برب الناس ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ غلط فہمی آخر کیسے لاحق ہوئی کہ یہ دونوں قرآن مجید کی سُورتیں نہیں ہیں؟ اس کا جواب ہمیں دو روایتوں کو جمع کر کے دیکھنے سے ملتا ہے۔ ایک یہ روایت کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے تھے کہ یہ تو ایک حکم تھا جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپ اِس طرح تعوّذ کیا کریں۔ دوسری وہ روایت جو کئی مختلف سندوں سے امام بخاری نے صحیح البخاری میں، امام احمد نے اپنی مُسند میں، حافظ ابوبکر الحُمَیدی نے اپنی مُسند میں، ابونُعیم نے اپنی المُستخرج میں اور نسائی نے اپنی سُنَن میں زِرّ بن حُبَیش کے حوالے سے تھوڑے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت اُبَیّ بن کعب سے، جو علمِ قرآن کے لحاظ سے صحابۂ کرام میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، نقل کی ہے۔ زِرّ بن حُبَیش کا بیان ہے کہ مَیں نے حضرت اُبَیّؓ سے کہا کہ آپ کے بھائی عبداللہ بن مسعودؓ ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ آپ ان کے اس قول کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ "مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اِس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا قُل، تو مَیں نے بھی کہا قُل۔ اس لیے ہم بھی اُسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ کہتے تھے"۔ امام احمد کی روایت میں حضرت اُبَیّ کے الفاظ یہ ہیں: "مَیں شہادت دیتا ہوں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے آپ سے قُل اعُوذ بربّ الفلق کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا، اور (انہوں نے قُل اَعُوذُ

برب الناس کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا، لہٰذا ہم بھی اُسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ نے کہا"۔ ان دونوں روایتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو دونوں سورتوں میں لفظ قُل (کہو) دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعوذ برب الفلق اور اعوذ برب الناس کہنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے حضورؐ سے اس کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حضرت اُبیؓ بن کعب کے ذہن میں بھی اس کے متعلق سوال پیدا ہوا اور انہوں نے حضورؐ سے اس کو پوچھ لیا۔ حضورؐ نے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے چونکہ قل کہا تھا اس لیے میں بھی قل کہتا ہوں۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ اگر کسی کو حکم دینا مقصود ہو اور اس سے کہا جائے کہ "کہو، میں پناہ مانگتا ہوں"، تو وہ حکم کی تعمیل میں یہ نہیں کہے گا کہ "کہو، میں پناہ مانگتا ہوں" بلکہ وہ "کہو" کا لفظ ساقط کرکے "میں پناہ مانگتا ہوں" کہے گا۔ بخلاف اس کے اگر کسی کو بالادست حاکم کا پیغام بر ان الفاظ میں پیغام پہنچائے کہ "کہو، میں پناہ مانگتا ہوں" اور یہ پیغام اُسے اپنے تک رکھنے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں تک پہنچانے کے لیے دیا جائے تو وہ لوگوں تک پیغام کے الفاظ کو جوں کا توں پہنچائے گا، اُس میں سے کوئی چیز ساقط کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ پس ان دونوں سورتوں کی ابتدا لفظِ قُل سے ہونا اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ کلامِ وحی ہے جسے حضورؐ انہی الفاظ میں پہنچانے کے پابند تھے جن الفاظ میں یہ آپ کو ملا تھا۔ اس کی حیثیت محض ایک حکم کی نہ تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہو۔ قرآن مجید میں ان دو سورتوں کے علاوہ ۳۳۰ آیتیں ایسی ہیں جو لفظ قُل (کہو) سے شروع ہوتی ہیں۔ ان سب میں قُل کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ کلام وحی ہے جسے اُنہی الفاظ میں پہنچانا حضورؐ کے ذمہ فرض تھا جن الفاظ میں یہ آپ پر نازل کیا گیا تھا۔ ورنہ ہر جگہ قُل اگر ایک حکم ہوتا تو حضورؐ اس لفظ کو ساقط کرکے وہ بات کہتے جس کے کہنے کا آپ کو حکم دیا گیا تھا، اور اُسے قرآن میں درج نہ کیا جاتا بلکہ حضورؐ صرف اس حکم کی تعمیل میں وہ بات کہہ دینے پر اکتفا فرماتے جسے کہنے کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔

اس مقام پر اگر آدمی کچھ غور کرے تو اُس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آسکتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کو بے خطا سمجھنا اور ان کی کسی بات کے لیے غلط کا لفظ سنتے ہی توہینِ صحابہ کا شور مچا دینا کس قدر بے جا حرکت ہے۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے قرآن کی دو سورتوں کے بارے میں کتنی بڑی چوک ہو گئی۔ ایسی چوک اگر اتنے عظیم مرتبہ کے صحابی سے ہو سکتی ہے تو

دوسروں سے بھی کوئی چوک ہو جانی ممکن ہے۔ ہم علمی تحقیق کے لیے اُس کی چھان بین بھی کر سکتے ہیں، اور کسی صحابی کی کوئی بات یا چند باتیں غلط ہوں تو انہیں غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ سخت ظالم ہو گا وہ شخص جو غلط کو غلط کہنے سے آگے بڑھ کر ان پر زبانِ طعن دراز کرے۔ انہی مُعَوِّذَتَین کے بارے میں مفسرین و محدثین نے ابنِ مسعودؓ کی رائے کو غلط کہا ہے، مگر کسی نے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ قرآن کی دو سورتوں کا انکار کر کے معاذ اللہ وہ کافر ہو گئے تھے۔

حضورؐ پر جادو کا اثر ہونا | دوسرا مسئلہ جو اِن سورتوں کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روایات کی رُو سے حضورؐ پر جادو کیا گیا تھا، اور اس کے اثر سے آپ بیمار ہو گئے تھے، اور اس اثر کو دُور کرنے کے لیے جبریل علیہ السلام نے آ کر آپ کو یہ سورتیں پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ اس پر قدیم اور جدید زمانے کے بہت سے عقلیت پسندوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ روایات اگر مان لی جائیں تو شریعت ساری کی ساری مشتبہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا تھا، اور ان روایات کی رُو سے ہو گیا تھا، تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مخالفین نے جادو کے زور پر نبی سے کیا کیا کہلوا اور کروا لیا ہو، اور اُس کی دی ہوئی تعلیم میں کتنی چیزیں خدا کی طرف سے ہوں اور کتنی جادو کے زیرِ اثر۔ یہی نہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اس بات کو سچ مان لینے کے بعد تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جادو ہی کے ذریعہ سے نبی کو نبوت کے دعوے پر اکسایا گیا ہو اور نبی نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ لیا ہو کہ اُس کے پاس فرشتہ آیا ہے۔ اُن کا استدلال یہ بھی ہے کہ یہ احادیث قرآن مجید سے متصادم ہیں۔ قرآن میں تو کفار کا یہ الزام بیان کیا گیا ہے کہ نبی ایک مسحور یعنی سحر زدہ آدمی ہے (یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ بنی اسرائیل، ۴۷)، مگر یہ احادیث کفار کے الزام کی تصدیق کرتی ہیں کہ واقعی نبی پر سحر کا اثر ہوا تھا۔

اِس مسئلے کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کیا درحقیقت مُستند تاریخی روایات کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہوا تھا؟ اور اگر ہوا تھا تو وہ کیا تھا اور کس حد تک تھا؟ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تاریخ سے ثابت ہے اس پر وہ اعتراضات وارد بھی ہوتے ہیں یا نہیں جو کیے گئے ہیں؟

قرونِ اولیٰ کے مسلمان علماء کی یہ انتہائی راستبازی تھی کہ انہوں نے اپنے خیالات اور مزعومات

کے مطابق تاریخ کو مسخ کرنے یا حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ جو کچھ تاریخی طور پر ثابت تھا اسے جُوں کا تُوں بعد کی نسلوں تک پہنچا دیا اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ اِن حقائق سے اگر کوئی اُلٹے نتائج نکالنے پر اُتر آئے تو اُن کا فراہم کردہ یہ مواد کس طرح اُس کے کام آسکتا ہے۔ اب اگر ایک بات نہایت مُستنَد اور کثیر تاریخی ذرائع سے ثابت ہو تو کسی دیانت دار صاحبِ علم کے لیے نہ تو یہ درست ہے کہ وہ اِس بنا پر تاریخ کا انکار کر دے کہ اُس کو مان لینے سے اُس کے نزدیک فلاں فلاں قباحتیں رونما ہوتی ہیں، اور نہ یہی درست ہے کہ جتنی بات تاریخ سے ثابت ہے اس کو قیاسات کے گھوڑے دوڑا کر اس کی اصلی حد سے پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کرے۔ اِس کے بجائے اُس کا کام یہ ہے کہ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے مان لے اور پھر دیکھے کہ اُس سے فی الواقع کیا ثابت ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔

جہاں تک تاریخی حیثیت کا تعلق ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادُو کا اثر ہونے کا واقعہ قطعی طور پر ثابت ہے اور علمی تنقید سے اُس کو اگر غلط ثابت کیا جا سکتا ہو تو پھر دنیا کا کوئی تاریخی واقعہ بھی صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اسے حضرت عائشہؓ، حضرت زَید بن اَرقم اور حضرت عبداللہؓ بن عباس سے بخاری، مسلم، نَسائی، ابن ماجہ، امام احمد، عبدالرزاق، حُمیدی، بَیہقی، طَبرانی، ابن سعد، ابنِ مَردُوْیَہ، ابن ابی شَیبہ، حاکم، عبد بن حُمید وغیرہ محدّثین نے اتنی مختلف اور کثیر التعداد سندوں سے نقل کیا ہے کہ اُس کا نفسِ مضمون تَواتُر کی حد کو پہنچا ہُوا ہے اگرچہ ایک ایک روایت بجائے خود خبرِ واحد ہے۔ اس کی تفصیلات جو روایات میں آئی ہیں انہیں ہم مجموعی طور پر تمام روایات سے مرتب کر کے ایک مربُوط واقعہ کی صورت میں یہاں درج کرتے ہیں۔

صُلحِ حُدَیبیہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرّم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادُوگر لَبید بن اَعْصَم سے ملا جو انصار کے قبیلۂ بنی زُرَیق سے تعلق رکھتا تھا[۱]۔ اِن لوگوں نے اُس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ

---

[۱] بعض راویوں نے اُسے یہُودی کہا ہے، اور بعض نے منافق اور یہود کا حلیف۔ لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ وہ بنی زُرَیق میں سے تھا، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ بنی زُرَیق یہودیوں کا کوئی قبیلہ نہ تھا بلکہ خزرج میں سے انصار کا ایک

جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے اُن پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی، مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں، کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو، یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں، انہیں قبول کرو اور محمدؐ پر ایک زور کا جادو کر دو۔ اُس زمانے میں حضورؐ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اُس سے سازباز کر کے اِن لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپؐ کے مُوئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لَبید بن اَعصم نے خود جادو کیا تھا، اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، ان سے اس نے جادو کروایا تھا۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف[۲] میں رکھ کر لَبید نے بنی زُرَیق کے کنویں ذَرْوان یا ذی اَرْوان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اِس جادو کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا، دوسری ششماہی میں کچھ تغیرِ مزاج محسوس ہونا شروع ہوا، آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضورؐ پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ آپؐ نے اسے کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا۔ ازواج کے متعلق آپؐ خیال فرماتے کہ اُن کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے —— اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپؐ کی ذات تک محدود رہے، حتٰی کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ آپؐ پر کیا گزر رہی ہے۔ رہی آپؐ کے نبی ہونے کی حیثیت تو اس میں آپ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اُس زمانے میں آپؐ قرآن کی کوئی آیت بھول گئے ہوں، یا کوئی آیت آپ نے غلط پڑھ ڈالی ہو، یا اپنی صحبتوں میں اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں

ہ قبیلہ تھا۔ اس لیے یا تو وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو اہلِ مدینہ میں سے یہودی ہو گئے تھے، یا یہود کا حلیف ہونے کی بنا پر بعض لوگوں نے اسے بھی یہودی شمار کر لیا۔ تاہم اس کے لیے منافق کا لفظ استعمال ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ مسلمان بنا ہوا تھا۔

[۲] ابتدا میں کھجور کا خوشہ ایک غلاف کے اندر ہوتا ہے۔ اور نر کھجور کے غلاف کا رنگ انسان کے رنگ سے ملتا جُلتا ہوتا ہے اور اس کی بُو انسان کے مادۂ منویہ جیسی ہوتی ہے۔

آپ کی تعلیمات کے اندر کوئی خرق واقع ہوگیا ہو، یا کوئی ایسا کلام آپ نے وحی کی حیثیت سے پیش کر دیا ہو جو فی الواقع آپ پر نازل نہ ہوا ہو، یا نماز آپ سے چھوٹ گئی ہو اور اس کے متعلق بھی کبھی آپ نے سمجھ لیا ہو کہ پڑھ لی ہے مگر نہ پڑھی ہو۔ ایسی کوئی بات معاذ اللہ پیش آجاتی تو دھوم مچ جاتی، اور پورا ملک عرب اس سے واقف ہوجاتا کہ جس نبی کو کوئی طاقت چت نہ کرسکی تھی اُسے ایک جادوگر کے جادو نے چت کر دیا۔ لیکن آپ کی حیثیتِ نبوی اس سے بالکل غیر متأثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی میں آپ اپنی جگہ اسے محسوس کرکے پریشان ہوتے رہے۔ آخر کار ایک روز آپؐ حضرت عائشہؓ کے ہاں تھے کہ آپؐ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اسی حالت میں نیند آگئی یا غنودگی طاری ہوئی اور پھر بیدار ہوکر آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں نے جو بات اپنے رب سے پوچھی تھی وہ اُس نے مجھے بتا دی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا وہ کیا بات ہے؟ آپؐ نے فرمایا دو آدمی (یعنی فرشتے دو آدمیوں کی صورت میں) میرے پاس آئے۔ ایک سرہانے کی طرف تھا اور دوسرا پائنتی کی طرف۔ ایک نے پوچھا انہیں کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو ہوا ہے۔ اُس نے پوچھا کس نے کیا ہے؟ جواب دیا لَبید بن اَعصم نے۔ پوچھا کس چیز میں کیا ہے؟ جواب دیا کنگھی اور بالوں میں ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ پوچھا وہ کہاں ہے؟ جواب دیا بنی زُریق کے کنویں ذی اَروان (یا ذَروان) کی تہ کے پتھر کے نیچے ہے۔ پوچھا اب اس کے لیے کیا کیا جائے؟ جواب دیا کہ کنویں کا پانی سونت دیا جائے اور پھر پتھر کے نیچے سے اُس کو نکالا جائے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت زبیرؓ کو بھیجا۔ ان کے ساتھ جُبیرؓ بن ایاس الزُّرَقی اور قیسؓ بن محصن الزُّرقی (یعنی بنی زُریق کے یہ دو اصحاب) بھی شامل ہوگئے۔ بعد میں حضورؐ خود بھی چند اصحاب کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ پانی نکالا گیا اور وہ غلاف برآمد کرلیا گیا۔ اُس میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور موم کا ایک پتلا تھا جس میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں۔ جبریل علیہ السلام نے آکر بتایا کہ آپ مُعوّذتین پڑھیں۔ چنانچہ آپ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اس کے ساتھ ایک ایک گرہ کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک ایک سوئی نکالی جاتی رہی۔ خاتمہ تک پہنچتے ہی ساری گرہیں کھل گئیں، ساری سوئیاں نکل گئیں، اور آپ جادو کے اثر سے نکل کر بالکل ایسے ہوگئے

جیسے کوئی شخص بندھا ہوا تھا، پھر کھل گیا۔ اس کے بعد آپ نے لَبید کو بلا کر باز پرس کی۔ اُس نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا، کیونکہ اپنی ذات کے لیے آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اِس معاملہ کا چرچا کرنے سے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اللہ نے شفا دیدی ہے، اب میں نہیں چاہتا کہ کسی کے خلاف لوگوں کو بھڑکاؤں۔

یہ ہے سارا قصّہ اِس جادُو کا۔ اِس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو آپ کے منصبِ نبوّت میں قادِح ہو۔ ذاتی حیثیت سے اگر آپ کو زخمی کیا جا سکتا تھا جیسا کہ جنگِ اُحُد میں ہوا، اگر آپ گھوڑے سے گِر کر چوٹ کھا سکتے تھے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے، اگر آپ کو بچھو کاٹ سکتا تھا جیسا کہ کچھ اور احادیث میں وارد ہوا ہے، اور ان میں سے کوئی چیز بھی اُس تحفظ کے مُنافی نہیں ہے جس کا نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا تھا، تو آپ اپنی ذاتی حیثیت میں جادُو کے اثر سے بیمار بھی ہو سکتے تھے۔ نبی پر جادُو کا اثر ہو سکتا ہے، یہ بات تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ سُورۂ اعراف میں فرعون کے جادوگروں کے متعلق بیان ہُوا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں جب وہ آئے تو انہوں نے ہزارہا آدمیوں کے اُس پورے مجمع کی نگاہوں پر جادُو کر دیا جو وہاں دونوں کا مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہُوا تھا (سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ ۔ آیت ۱۱۶)، اور سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو لاٹھیاں اور رسیاں انہوں نے پھینکی تھیں ان کے متعلق عام لوگوں ہی نے نہیں حضرت موسیٰ نے بھی یہی سمجھا کہ وہ اُن کی طرف سانپوں کی طرح دوڑی چلی آ رہی تھیں اور اس سے حضرت موسیٰ خوف زدہ ہو گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو تم ہی غالب رہو گے، ذرا اپنا عصا پھینکو (فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ، فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ، قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ ۔ آیات ۶۶ تا ۶۹)۔ رہا یہ اعتراض کہ یہ تو کفارِ مکّہ کے اُس الزام کی تصدیق ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سحر زدہ آدمی کہتے تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفّار آپ کو سحر زدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ کسی جادُو کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں، بلکہ اِس معنی میں کہتے تھے کہ کسی جادُوگر نے معاذ اللہ آپ کو پاگل کر دیا ہے اور اسی پاگل پن میں آپ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں اور جنت و دوزخ کے افسانے سنا رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اعتراض ایسے معاملہ پر سرے سے چسپاں ہی نہیں ہوتا جس کے متعلق تاریخ

سے یہ ثابت ہے کہ جادُو کا اثر صرف ذاتِ محمدؐ پر ہوا تھا، نبوّتِ محمدؐ اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔

اِس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ جادُو کو محض اوہام کے قبیل کی چیز قرار دیتے ہیں ان کی یہ رائے صرف اِس وجہ سے ہے کہ جادُو کے اثرات کی کوئی سائنٹفک توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں، مگر سائنٹفک طریقہ سے یہ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیسے رونما ہوتی ہیں۔ اِس طرح کی توجیہ پر اگر ہم قادر نہیں ہیں تو اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس چیز ہی کا انکار کر دیا جائے جس کی ہم توجیہ نہیں کر سکتے۔ جادُو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گزر کر جسم کو بھی اسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گزر کر نفس کو متاثر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوف ایک نفسیاتی چیز ہے، مگر اس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن میں تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔ دراصل جادُو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی، مگر انسان کا نفس اور اس کے حواس اُس سے متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہو گئی ہے۔ حضرت مُوسیٰ کی طرف جادُوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسّیاں پھینکی تھیں وہ واقعی سانپ نہیں بن گئی تھیں، لیکن ہزاروں کے مجمع کی آنکھوں پر ایسا جادُو ہوا کہ سب نے انہیں سانپ ہی محسوس کیا، اور حضرت موسیٰ تک کے حواس جادُو کی اِس تاثیر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اِسی طرح قرآن (البقرہ، آیت ۱۰۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ بابل میں ہاروت اور ماروت سے لوگ ایسا جادُو سیکھتے تھے جو شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی اثر تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر تجربے سے لوگوں کو اِس عمل کی کامیابی معلوم نہ ہوتی تو وہ اس کے خریدار نہ بن سکتے تھے۔ بلاشبہ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ بندوق کی گولی اور ہوائی جہاز سے گرنے والے بم کی طرح جادُو کا مؤثر ہونا بھی اللہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر جو چیز ہزارہا سال سے انسان کے تجربے اور مشاہدے میں آ رہی ہو اس کے وجود کو جھٹلا دینا محض ایک ہٹ دھرمی ہے۔ (باقی)

ایمان اور استقامت[1]

از: عبدالحمید صدیقی

امید و رضا، سکونِ قلب، اور محبت، ایمان کے وہ پسندیدہ ثمرات ہیں جن سے ہر صاحبِ ایمان مستفید ہوتا ہے، اور جو معرکۂ حیات کے مصائب و آلام سے پُر اور صبر آزما لمحات میں خاص طور پر مومن کے بہترین ہتھیار سمجھے گئے ہیں۔ اِن ہتھیاروں کی مستقل ضرورت کا احساس اس وقت اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب دنیا کی حقیقت انسان پر آشکار ہوتی ہے۔ یہاں دنیا میں حادثات ناگزیر ہیں۔ شدائد و محن سے ساکنانِ ارض دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو ناسازگار حالات کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں اور طویل جد و جہد بھی کسی طرح مُثمِر نہیں ہوتی۔ بعض کے عزیز انتقال کر جاتے ہیں۔ بعض کو کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ اور بہتیرے بدنصیب وہ ہیں جن کی عمر بھر کی پونجی لُٹ جاتی ہے۔ الغرض اس دنیا میں بہت کچھ رونما ہوتا رہتا ہے جو طبعِ انسان پر ناقابلِ بیان حد تک ناگوار گزرتا ہے، اور اس کی امنگوں اور آرزوؤں کو خاک میں ملا کر رکھ دیتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

جُبِلت علی کدرٍ و انت تریدها ۔۔۔ صفواً من الآلام و الاکدار!!

و مکلفُ الایام ضدَّ طباعها ۔۔۔ متطلب فی الماء جذوةَ نار!!

(ترجمہ) دنیا ایک مقامِ تکدر ہے لیکن اے انسان تو اسے غموں اور کدورتوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اس کے مزاج کے برعکس ہے۔ اور انسان یہ خواہش کر کے گویا پانی کے ذخیرے سے آگ کا انگارہ طلب کرتا ہے۔

حیاتِ دنیا میں مصائب و آلام کا وجود اللہ کی سُنّت کے عین مطابق ہے۔ اور یہ سب انسانوں سے متعلق ہے۔ لیکن اللہ کے پیغمبر گردشِ روزگار کا خاص طور پر شکار ہوتے ہیں۔ جب وہ لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاتے

---

[1] اس مضمون کا بیشتر مواد یوسف القرضاوی کی کتاب الایمان والحیاۃ سے لیا گیا ہے۔

ہیں اور خواہشاتِ نفس کی پیروی سے روکتے ہیں تو کفر کے علمبردار اور نفس کے بندے اُن کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ پھر جب یہ صاحبانِ رُشد و ہدایت معروف کا حکم دینے اور منکرات کا استیصال کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو آہستہ آہستہ تمام طاغوتی طاقتیں ان کے خون کی پیاسی بن جاتی ہیں اور اس طرح جانگسل آزمائشوں کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے جس سے اہلِ حق کو گزرنا پڑتا ہے۔ قصۂ آدم و ابلیس، کشمکشِ ابراہیم و نمرود، معرکۂ موسیٰ و فرعون اور محاربہ محمدؐ و ابوجہل معرکۂ حق و باطل کے مختلف مظاہر ہیں۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا (الانعام: ۱۱۲) "اور ہم نے ہمیشہ اسی طرح شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے رہے ہیں"۔

انبیاء آزمائشوں کی بھٹی میں ڈالے گئے اور ان کے جانشینوں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ اور ہر وہ شخص جو اُن کی نیابت ہوتی راہِ حق پر گامزن رہا، دینِ حق کے باغیوں نے انہیں تکلیفیں پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا "مصیبتوں کے پہاڑ کن انسانوں پہ ٹوٹتے ہیں؟" آپ نے ارشاد فرمایا "انبیاء و رُسل پر، پھر وہ جو پیرویٔ حق و صداقت میں اُن سے زیادہ قریب ہوں، پھر وہ جو ان کے مشابہ ہوں۔ یاد رکھو آدمی پر یہ ابتلا اُس کے دین کے مطابق آتے ہیں۔ اگر وہ پیرویٔ دین میں زیادہ سخت ہو تو اس کی آزمائشیں بھی سخت ہوتی ہیں۔ اور اگر اس کا دین کمزور ہو تو اس پر نازل ہونے والی مصیبتیں بھی معمولی ہوں گی۔"

اہلِ ایمان کی استقامت کی مثالیں سامریہ کی اسرائیلی ریاست کا جب اشوریوں کے ہاتھوں خاتمہ ہو گیا اور یروشلم کی یہودی ریاست کے سر پہ تباہی کا طوفان کھڑا تھا تو یرمیاہ نبی نے اپنی قوم کو متنبہ کرنا شروع کر دیا کہ سنبھل جاؤ ورنہ تمہارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا۔ مگر قوم کی طرف سے ان کو جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے اُن پہ لعنت اور پھٹکار کی بارش ہوتی، پیٹے گئے، قید کیے گئے اور آخر میں رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے گئے تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں سوکھ سوکھ کر مر جائیں۔ بایں ہمہ اللہ کے پیغمبر نے پیغامِ حق سنانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور مخالفین کی ناقابلِ برداشت اذیتوں کے مقابلے میں کمالِ صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا مگر اس بدبخت قوم نے ان کی ایک نہ سنی۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے عہد کا یہودی فرمانروا ہیرو د اینٹی پاس رومی تہذیب کے اثرات سے پوری طرح متاثر تھا۔ اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فسق و فجور پھیل رہا تھا۔ خود اُس نے اپنے بھائی کی بیوی

ہیرودیاس کو گھر میں ڈال رکھا تھا حضرت یحییٰ نے اس پر ہیرودیاس کو ملامت کی اور اُس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اِس جُرم میں ہیرودس نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ مگر اس کی بیوی نے اس سزا کو کافی نہ سمجھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یحییٰ علیہ السلام جو اخلاقی روح قوم میں پھونک رہے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں اس جیسی عورتوں کی تذلیل کا باعث بن رہی ہے۔ چنانچہ وہ ان کی جان کے درپے ہو گئی۔ آخر کار ہیرودس کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پا لیا جس کی وہ تاک میں تھی۔ جشن کی تقریب میں اس کی بیٹی نے رقص پیش کیا جس پر خوش ہو کر ہیرودس نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے؟ بیٹی نے فاحشہ ماں سے پوچھا کیا مانگوں۔ ماں نے کہا یحییٰ کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرودس سے کہا مجھے یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجیے۔ اس نے فوراً حضرت یحییٰ کا سر قلم کرنے کا حکم دیا اور رقاصہ کی نذر کر دیا۔ یہ وہ سلوک تھا جو ہیرودس نے اپنے اس جلیل القدر پیغمبر کے ساتھ کیا اور اسارت و قتل کے مقابلے میں وہ ثبات و استقامت تھی جو ہمیں سیدنا یحییٰ کی ذات میں مجسم ملتی ہے۔

نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی یُوں تو استقامت کی جیتی جاگتی مثال ہے، تاہم ابتلاء و آزمائش کا وہ دور جس سے آپ منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد گزرے اور جو مکی زندگی کے آخری سالوں میں شدت اور سنگینی کے اعتبار سے دورِ عروج تھا۔ اُس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہماری مراد شعبِ ابی طالب میں آلِ ہاشم کے محصور ہونے سے ہے۔ آدمی بسا اوقات تنہا ایک مصیبت کو برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن جب وہ مصیبت ایک شخص کی وجہ سے پورے خاندان اور برادری پر ٹوٹ رہی ہو اور اس ابتلاء کا سلسلہ دو چار دس دن تک نہیں بلکہ سالوں تک پھیلتا ہوا نظر آئے تو برادری کے مختلف المزاج اصحاب کا ردِعمل دیکھ کر بڑے بڑے دل گردے کے انسان بھی ہل جاتے ہیں اور ان کے پائے ثبات میں لغزش آ جاتی ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت اس معنی میں بے مثال ہے کہ آپ، آلِ ہاشم سمیت پورے تین برس اس گھاٹی میں رہے۔ اس دوران میں صحابہ کا بیان ہے کہ ہم ببول کی پتیاں کھا کر وقت گزارا کرتے۔ کبھی کوئی سوکھا چمڑا ہاتھ لگتا تو اسے پانی میں بھگو کر اور آگ پہ بھوننے کے بعد کھا لیتے۔ چھوٹے بچے بھوک سے نڈھال ہو کر روتے تو دُور دُور تک ان کے رونے کی آواز سنائی دیتی اور بے درد قریش اس آہ و بکا کو سُن کر خوش ہوتے۔ اپنے رفقاء و احباب کو یُوں تکلیف میں مبتلا دیکھ کر رسولِ مقبول کے دل پہ جو کچھ گذرتی ہو گی اس کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ مگر آپ ان تمام صعوبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔

مصیبت اور محصوری کا یہ دور ختم ہوا ہی تھا کہ ابو طالب اور ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا چند ہی دنوں میں یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ ان دونوں محترم ہستیوں کا اٹھنا تھا کہ کفارِ قریش اذیت رسانی میں کچھ زیادہ ہی دلیر ہو گئے۔ اور فقر و فاقہ کا عالم جو پہلے ہی ناگفتنی تھا اس میں اور بھی شدت آ گئی۔ انہیں المناک حالات کا ذکر کرتے ہوئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے اللہ کی اطاعت کرنے کی بنا پہ اس قدر خوفزدہ کیا گیا کہ اتنا خوف کسی دوسرے کو نہیں دلایا گیا۔ اور اللہ کے احکام بجا لانے کی وجہ سے اس قدر اذیت پہنچائی گئی کہ اتنی اذیت میں کسی دوسرے کو کبھی مبتلا نہیں کیا گیا۔ اور مجھ پر ایسے سخت حالات آئے کہ متواتر تیس دن تک میرے اور بلال رضؓ کے لیے کھانے کو کوئی چیز نہ ہوتی ۔۔ کوئی چیز جسے جاندار کھا سکے ۔۔ سوائے اس قلیل مقدار کے جو بلال زیرِ بغل رکھتے۔ (ترمذی بروایتِ انس)۔

ظلم و ستم کا نشانہ تنہا رسولِ پاک ہی نہ تھے بلکہ اس دور میں کم و بیش ہر مسلمان پہ مشقِ ستم ہوتی اور نہایت کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ امیّہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو عرب کی تپتی ریت پر یہ ظالم آپ کو لٹا دیتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا تاکہ جنبش نہ کرنے پائیں۔ پھر اُن سے کہتا کہ اسلام سے منہ موڑ لو ورنہ یونہی گھٹ گھٹ کے مرجانا ہو گا۔ لیکن حضرت بلالؓ کی زبان حق ترجمان سے صرف ایک ہی بات نکلتی اَحَد اَحَد هُوَ اللهُ اَحَد۔ جب امیہ دیکھتا کہ ان کے پائے ثبات متزلزل نہیں ہو رہے تو گلے میں رسی ڈال کر اوباش جوانوں کے حوالے کر دیتا جو انہیں شہر کے اس سرے سے دوسرے سرے تک گھسیٹتے پھرتے۔ حضرت خبّاب بن ارت قبیلہ بنی تمیم کے فرد تھے جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے۔ انہوں نے اُس وقت اسلام قبول کیا جب بمشکل چھ سات سعادت مند حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے تھے۔ قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھاتے اور ان پر انہیں چت لٹا دیا۔ ایک شخص چھاتی پہ پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے دب کر ٹھنڈے ہو گئے۔ حضرت عمار، ان کے والد یاسر اور والدہ سمیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر بھی جور و جفا کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔ حضرت عمارؓ کو قریش اس قدر مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے۔ حضرت یاسر کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے۔ اور حضرت سمیّہؓ وہ باشرف خاتون ہیں جنہوں نے سب سے پہلے خدا کی راہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ ابو جہل نے اسلام لانے کے جرم میں انہیں برچھی مار کر شہید کر دیا تھا۔

اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے چند ایک کی استقامت کا یہ تذکرہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے

کہ پوری اسلامی تاریخ اہلِ ایمان کی استقامت سے مزیّن ہے۔ صحابۂ کرام کے بعد تابعینِ عظّام، ائمہ اربعہ، محدثین اور دیگر بے شمار صلحائے اُمت کی زندگیاں اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ یہ صرف ایمان ہی ہے جو بندگانِ خدا کو انتہائی نامساعد حالات میں استقامت بخشتا ہے۔ طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں بلند حوصلگی اور جرأت سے ڈٹ جانے کی تعلیم دیتا ہے اور سنگ و آہن سے مضبوط عزم و ہمت عطا کرتا ہے۔

منکرینِ خدا مصیبتوں سے زیادہ گھبراتے ہیں

اس کے برعکس تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ سب سے زیادہ گھبرا جانے والے اور شدائدِ حیات کے سامنے جلد گھٹنے ٹیک دینے والے لوگ بالعموم وہ ہوتے ہیں جو خدا کو نہیں مانتے یا ریب و تشکیک کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو تقدیر کے قائل ہوتے ہیں کہ اُس پہ راضی ہو جائیں، نہ خدا کو مانتے ہیں کہ اُس کی حکمتوں پہ مطمئن ہو سکیں۔ نہ انبیاء و صلحاء کی مصیبتوں بھری زندگی میں ان کے لیے کوئی نمونہ ہوتا ہے کہ جس سے انھیں صبر و ثبات کی رہنمائی مل سکے۔ اور نہ حیات بعد الموت پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہاں کی جزا و سزا انھیں کچھ تسلی دے سکے۔ ان کی مثال اُس کشتی کی سی ہے جس کے پتوار اور بادبان گم ہو چکے ہوں اور سمندر کے تند و تیز اور سرکش تھپیڑے چار جانب سے اسے غرق کرنے کے درپے ہوں۔ کیا اس کشتی کو غرق ہونے سے کوئی چیز بچا سکتی ہے۔ اور کیا اُسے ہر وقت غرق ہو جانے کا خوف لاحق نہ رہے گا؟ بالکل اسی بے اطمینانی اور گھبراہٹ سے منکرینِ خدا ہر لمحہ دوچار رہتے ہیں۔

اہلِ ایمان کی استقامت اور اس کا ماخذ

مومنین سب سے زیادہ صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور ہر نوع کی مصیبتوں پر ثبات و استقامت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ حیاتِ دنیا کو حیاتِ اُخروی کے مقابلے میں بہت حقیر سمجھتے ہیں۔ اتنا حقیر کہ اُس کے درد و الم کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ (النساء ۴: ۷۷) دوسری وجہ یہ ہے کہ مومن حیاتِ دنیا کے بارے میں سنت اللہ کا واضح شعور رکھتا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ دنیا میں انسان کو عقل و فکر اور ارادہ و اختیار کی آزادی دے کر بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس کی آزمائش کی جائے۔ چنانچہ اسے مصائب کے نزول پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ البتہ اسے تعجب اُس وقت ضرور ہوتا ہے جب دارالمحن میں دارالجزاء کی سی سہولتیں میسر آجاتی ہیں۔ تیسری چیز جو اہلِ ایمان کو ثبات و استحکام عطا کرنے والی ہے وہ پیغمبروں کے حالات ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ صداقت کے علم بردار ہر دور میں ستائے جاتے رہے ہیں۔ کون سا مکر و فریب اور کون سی چال ہے جو اہلِ کفر نے اُن کے خلاف نہیں چلی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جلتی آگ کے شعلوں میں پھینک دیا گیا۔ سیدنا زکریا علیہ السلام کو آرے سے چیر ڈالا گیا۔

امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو طائف کے بازار میں اس قدر لہولہان کیا گیا کہ آپ بار بار غش کھا کر زمین پر گر پڑتے تھے۔ یہ خوفناک مناظر اور اُن میں حضرات انبیاء کی مثالِ استقامت، اہلِ ایمان کی نظروں کے سامنے رہتی ہے اور اُن کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آنے دیتی۔

تقدیر پر ایمان، مومن کے لیے ابتلاء کو آسان بنا دیتا ہے | نازل ہونے والی ہر مصیبت کے بارے میں مومن یہ سمجھتا ہے کہ یہ کسی اندھی بہری طاقت کی طرف سے بے سوچے سمجھے پڑنے والی افتاد نہیں بلکہ وہ قضائے مبرم اور نوشتۂ تقدیر ہے جو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا اور اس قضا کے پیچھے اس حکیم و دانا کا علم و ارادہ کارفرما ہے جو بندے کی قوت و طاقت اور ابتلاء کی سختی و شدت کا خوب اندازہ رکھتا ہے۔ جس کا ہر فیصلہ کمال درجہ کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور جس کی رحمت و شفقت اس کے قہر و غضب پر بہرحال غالب رہتی ہے۔ دورانِ مصیبت مومن کے ذہن میں یہ بات بھی برابر رہتی ہے کہ زندگی کی تلخیاں اور حادثات اس کے لیے قیمتی اسباق ہیں اور دین و دنیا کے نفع بخش تجربات بھی۔ جو اس کے مزاج کو پختگی اور اس کے ایمان کو جلا بخشتے ہیں اور اُس کے دل کا زنگ دُور کر کے رکھ دیتے ہیں۔ رافعی نے کتنے بلیغ انداز میں بیان کیا: "انڈے کی سفیدی اور زردی کے لیے اس کا خول ایک قید خانہ ہی تو ہے۔ لیکن اسی قید خانے میں سفیدی اور زردی کو مختلف سخت مراحل سے گذرنے کے بعد ایک حسین و جمیل چوزے کی شکل اختیار کرنا ہوتی ہے۔ اب اگر انڈے کا سیال مواد ایک مدتِ معینہ کے لیے صبر نہ کرے تو دسترخوانِ شاہی کا وہ جزوِ لذیذ جسے مرغ کہتے ہیں کس طرح وجود میں آ سکتا ہے۔" ٹھیک اسی طرح مومن اللہ کی تقدیر پر مکمل بھروسہ رکھتے ہوئے دنیا کی آزمائش کی سرحدی سے گذر جاتا ہے اور آفات و حوادثِ روزگار کو زیادہ محسوس نہیں کرتا کیونکہ ساکنِ فردوس کی حیثیت سے نہایت حسین انجام اُس کا مقدر ہوتا ہے۔

مصائبِ دنیا اہلِ ایمان کی نظر میں | حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے بیک وقت دو مصیبتیں آئیں۔ ایک کا تعلق دین سے تھا، دوسری کا دنیا سے، یعنی یا تو عزیزِ مصر کی بیوی کی ناجائز خواہش پوری کریں یا برسوں جیل میں رہیں اور مشقت و صعوبت کا سامنا کریں۔ مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اللہ سے عرض کی رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْہِ (یوسف: ۳۳) "میرے پروردگار! مجھے جیل خانے کی زندگی اس کام سے عزیز تر ہے جس کی طرف یہ لوگ مجھے بلاتے ہیں۔"

سلف میں سے ایک بزرگ نے فرمایا مجھ پر جب بھی کوئی دنیاوی مصیبت آتی ہے مجھے احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر تین احسانات کیے ہیں جن کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ پہلا احسان یہ کہ اس مصیبت کا

تعلق میری دنیا سے ہے میرے دین سے نہیں کیونکہ دنیا کے نقصان کی کوئی بات نہیں مگر دین کا نقصان تو ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ دوسرا احسان یہ کہ جو مصیبت آئی ہے اُس سے بڑی مُصیبت میں بھی اللہ تعالیٰ مبتلا کر سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اُس سے بچا لیا۔ تیسرا احسان یہ کہ مصیبت پر صبر کرنے کا ثواب اللہ تعالیٰ میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیتے ہیں جو مجھے بہر حال ملنا ہے۔ بنا بریں کسی مصیبت پر رنج و غم کا اظہار کرنے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح ایک اور مردِ حق آگاہ سے منقول ہے کہ انہیں پاؤں میں کوئی تکلیف تھی۔ جب بھی شدید درد ہوتا تو وہ مُسکرا دیتے اور اِنّا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے۔ اُن سے کہا گیا کہ آپ کو اتنا سخت درد ہوتا ہے مگر آپ کراہتے تک نہیں۔ فرمانے لگے" درد کے ثواب کی مٹھاس اس کی تکلیف کی تلخی کو بُھلا دیتی ہے"۔

حضرت عُروہ بن زبیرؓ فقہائے تابعین میں نہایت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے ایک پاؤں کو ایسی بیماری لگ گئی کہ جس کی وجہ سے اطباء نے اُسے بلاتاخیر کاٹنے کا حکم دے دیا تاکہ بیماری کے اثرات پنڈلی اور ران تک منتقل نہ ہو جائیں۔ حضرت عروہؒ نے پاؤں کو بخوشی آرے کے نیچے رکھ دیا۔ اس موقع پر اُن کی خدمت میں پینے کے لیے ایک دوائی پیش کی گئی تاکہ اُن کے حواس معطل ہو جائیں۔ اور وہ قطع عضو کی تکلیف کو محسوس نہ کریں۔ جب آپ کو دوائی کی خاصیت کا پتہ چلا تو آپؒ نے فرمایا "میں نہیں سمجھتا کہ اللہ پر ایمان رکھنے والا شخص ایسی دوائی پی سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس کا شعور معطل ہو جائے اور وہ کسی چیز کا ادراک نہ کر سکے حتیٰ کہ اللہ کا بھی۔ آئیے اور پاؤں کاٹ دیجیے۔ چنانچہ ٹخنے سے آپ کا پاؤں کاٹ دیا گیا اور آپ خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہے۔ معمولی تکلیف کا بھی آپ نے اظہار نہ کیا۔ کرنا خدا کا اُسی رات آپ کا بیٹا ___ جسے آپ باقی تمام بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ___ چھت پر سے گرا اور جاں بحق ہو گیا۔ لوگ آپ کے پاس تعزیت کے لیے آتے تو آپ نے فرمایا "یا اللہ تیرا شکر ہے میرے سات بیٹے ہیں تُو نے صرف ایک لیا ہے۔ اور باقی چھ میرے پاس رہنے دیئے۔ خود مجھے اے اللہ تُو نے دو ہاتھ اور دو پاؤں دیئے تھے اور ان چار میں سے تین ابھی میرے پاس ہیں، صرف ایک ہی کاٹا گیا ہے۔ اگر تُو نے میری یہ پیاری چیزیں لے لی ہیں تو دی بھی تو تُو نے ہی تھیں۔ آزمائش تیری طرف سے آئی ہے تو عافیت سے بھی تُو نے ہی نواز رکھا تھا۔

مذکورہ واقعات سے ویسے تو بہت سے حقائق واضح ہوتے ہیں تاہم چند ایک کی طرف اشارہ کر دینا

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اوّلاً مومن متاعِ دنیا کے نقصان کو چنداں اہمیت ہی نہیں دیتا۔ ثانیاً وہ متوقع بڑی مصیبت کے پیشِ نظر موجودہ مصیبت پر بآسانی صبر کر لیتا ہے۔ ثالثاً وہ اُس اجرِ جزیل پر نگاہ رکھتا ہے جو مصیبت پر صبر کرنے والے کو اللہ کی طرف سے عطا ہوگا جیسا کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم میں ہے۔ مسلمان کو جو بھی غم یا فکر لاحق ہوتا ہے یا تھکاوٹ اور بیماری لگ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اسے جو کانٹا تک بھی چُبھتا ہے اللہ تعالیٰ ان سب پریشانیوں اور مصیبتوں کو اُس کے گناہوں کا کفّارہ بنا دیتا ہے۔

مُلحدین کا اعترافِ حقیقت | ایمان، انسان کو ثبات و استقامت کی جو طاقت عطا فرماتا ہے اُس کا اعتراف وہ لوگ بھی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو اپنے مادّی نظاموں اور فلسفوں کے گُن گاتے نہیں تھکتے۔ متعصب اشتراکیوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ اُن کا نظام دوسری عالمگیر جنگ میں لوگوں کو ڈٹ جانے اور ثابت قدمی دکھانے کا وہ مظاہرہ نہ کر سکا جو دین و ایمان نے کیا۔ چنانچہ اُنہیں حالات نے مجبور کر دیا کہ لوگوں کو وقتی طور پر دینِ فطرت کی طرف پلٹ جانے کی اجازت دے دیں تاکہ اُن کے باطن کا وہ خلا پُر ہو سکے جسے کوئی مادّی و جدلی فلسفہ پُر نہ کر سکا تھا۔

تصحیح اغلاط

	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
جلد اوّل :	۲۴۳	۱۰	جانداروں میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو	بے جان میں سے جاندار کو نکالتا ہے اور جانداروں میں سے بے جان کو
جلد پنجم :	۳۲	۱	يَكُوْنُوْا	يَكُوْنُوْا
	۱۹۵	۱	شَدِيْدُ انقوی	شَدِيْدُ الْقُوٰی
جلد ششم :	۵۵۶	۱۰	يُخَيَّلُ اِلَيْهِ اَنَّهَا	يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا
	۳۶۴	آخری سطر	تمہاری نافرمانی	تمہاری فرمانبرداری

راہ و رسمِ منزل

سید اسعد گیلانی صاحب

آج کے اس دَور میں ہمارا مُسلم معاشرہ زبردست تخریب و انتشار سے دوچار ہے۔ اخلاقی قدریں منہدم ہوتی جا رہی ہیں۔ اخلاق کے پیمانے ٹوٹ رہے ہیں۔ اتحادِ ملّی افتراق کی طوفانی رَو کی زد میں ہے۔ تہذیب و شائستگی کی حدود پھلاندی جا رہی ہیں۔ سماجی اور معاشرتی دائرے سے اعتماد و احترام رخصت ہو رہا ہے۔ معاشی میدان میں کمزور آزاری ایک معمول بن چکی ہے۔ سیاست انتظامِ مملکت اور تہذیبِ معاشرہ کا ذریعہ نہیں بلکہ جبر و تشدّد اور مظاہرۂ قوت کا راستہ بن گئی ہے۔ غیر اسلامی تصورات و اثرات نے ہمارے پورے ملّی وجود پر دھاوا بول رکھا ہے اور ہماری زندگی کا اب کوئی شعبہ ایسا نہیں رہ گیا ہے جسے اخلاق و تہذیب کے پیمانے سے ناپیں تو اسے کسی درجے میں بھی اطمینان بخش قرار دے سکیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ملّت کی کشتی ہلاکت خیز طوفان کی ہیبتناک لہروں میں گھِر گئی ہے بلکہ ہمارے قومی افتراق کی چٹان سے ٹکرا کر دو ٹکڑے ہو چکی ہے۔ کافر طاقتیں ہماری تباہی پر خوش ہیں۔ لیکن ہم اب تک باہمی جنگ و جدل میں مصروف ہیں اور اپنی ملّی خودکشی کے تدریجی عمل کو مسلسل پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی ساری قوتیں صرف کر رہے ہیں۔

اس کے نتیجے میں اب ہماری حالت کچھ ایسی بن کر رہ گئی ہے کہ ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

اس ہیجان اضطراب اور پریشانی میں مبتلا لوگ حالات کی سنگینی اور بحران کی شدت میں عجیب عجیب باتیں سوچنے لگتے ہیں اور مضطرب ہو کر تعمیرِ ملت کے لیے طرح طرح کی تجاویز ان کے سامنے آتی ہیں۔ چونکہ ملّت کے انحطاط و زوال کے اس بھیانک دَور میں ایک اسلامی تحریک بھی موجود ہے جو اس ملت کی تعمیر و ترقی احیائے دین اور دعوتِ اسلامی کا کام کر رہی ہے اس لیے اخلاق و اسلام سے محبت رکھنے والے لوگ فطری

طور پر اس کی کامیابی کو اپنی کامیابی اور اس کی ناکامی کو اپنی ناکامی سمجھتے ہیں۔ دعوتِ اسلامی کو آگے بڑھانے اور ناکامیوں سے بچانے کے لیے ان کے ذہن مختلف تجاویز و تدابیر لا کر سامنے رکھتے ہیں اور تحریک کی طرف سے ٹھنڈے اور دھیمے طرزِ عمل پر ان میں کبھی کبھی جھنجلاہٹ کے آثار بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس تمام سلسلہ ہائے خیالات پر غور و فکر کرنے کے لیے ابتدائی طور پر ہمیں چند باتیں اپنے ذہن میں رکھنی چاہییں۔

تحریکِ اسلامی کے چند پہلو

(۱) ہر اسلامی تحریک انسان کی پوری زندگی کو بندگیِ رب کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اٹھتی ہے اور خدائی احکام کے نفاذ و ترویج کی دعوت دیتی ہے۔ احکام کا تعلق چونکہ انسان کی شخصی اور اجتماعی زندگی کے دونوں پہلوؤں سے ہوتا ہے اس لیے لازماً اسے بیک وقت فرد، معاشرے اور حکومت کی اصلاح کے لیے اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ انفرادی اصلاح کے لیے اسے بنیادی طور پر بگڑے ہوتے معاشرے میں سے اُن افراد کو چھانٹنا ہوتا ہے جو اصلاح کو قبول کر کے اپنی عملی زندگی میں اسے نافذ کریں۔ اصلاح قبول کرنے والوں اور قبول نہ کرنے والوں کے درمیان امتیاز قائم رکھنا اس کے لیے نہایت ضروری ہوتا ہے تاکہ صحیح قسم کے لوگ اس تحریک کی نمائندگی کریں اور جس نوعیت کے معاشرے کی تشکیل کے لیے وہ جدوجہد کر رہی ہے اس کا ایک نمونہ اس کی جماعتی زندگی میں بھی نظر آئے اور بندگیِ رب کے اثرات تحریک کے لیے کام کرنے والے افراد کی زندگیوں میں بھی نمایاں ہوں۔ پھر انہیں افراد کی مدد اور تنظیم سے وہ معاشرے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور جس تناسب سے معاشرے کی اصلاح ہو اسی تناسب سے حکومت کی اصلاح کی کوشش ممکن ہوتی ہے۔

(۲) ایک اسلامی تحریک کسی باطل نظام کے غلبے کی حالت میں ہی نمودار ہوتی ہے تاکہ اس غلبے کو توڑ سکے۔ اسلامی نظام کی موجودگی میں اقامتِ دین کی کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خود اسلامی حکومت اور اس کے کارپرداز ہی اسلامی تحریک کے کارکنوں کا کام کرتے ہیں۔ باطل نظام کے غلبے کی حالت کافرانہ معاشرے میں بھی ہو سکتی ہے اور بگڑے ہوتے نام نہاد مسلم معاشرے میں بھی۔

(۳) خالص کافرانہ معاشرے میں باطل نظام کے خلاف جدوجہد کرنے میں اسلامی تحریک کو ایک لحاظ سے یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ اس کی دعوت کے نتیجے میں معاشرے کا جو فرد بھی اسلامی دعوت کو قبول کرتا ہے وہ اپنی ذات، خاندان اور معاشرے سے پہلے ہی مرحلے میں لڑ کر اپنا مخلص، جاں نثار، ایثار پیشہ اور بہادر ہونا ثابت کر دیتا ہے اور دعوت کو قبول کرنے کے اولین مرحلے پر ہی اس تحریک کے بہترین کارکنوں میں شامل ہو جاتا ہے پھر جو کچھ تحریک اسے سکھاتی ہے وہ تن من دھن سے اس کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ قیمتی سے قیمتی مفاد کو وہ تحریک کے

لیے چھوڑ دیتا ہے اور بڑی سے بڑی آزمائش کی بھٹی سے وہ گزر جاتا ہے۔ خواہشاتِ نفس سے لیکر عالیشان محلات تک کوئی اس کی راہ کا روڑا نہیں بن سکتے۔ لیکن بگڑے ہوئے مسلم معاشرے میں جہاں باطل نظام مسلط ہو گیا ہو وہاں مدعیانِ ایمان کی بڑی تعداد کو یہ نظام اپنے غالب اثرات کے ساتھ مصالحت کرنے کے نتیجے میں اس مقام پر لے آتا ہے کہ ان کی اصلاح کے لیے محض اقرارِ دعوت کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ انحطاط کے جس مقام تک وہ پہنچے ہوئے ہوتے ہیں وہ اقرارِ ایمان کے ساتھ ساتھ ہی پہنچے ہوتے ہوتے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کو ایسے ایک مسلم معاشرے میں کام کرنے کی یہ ابتدائی سہولت ضرور حاصل ہوتی ہے کہ اسے اسلامی دعوت کے منکرین سے سابقہ پیش نہیں آتا اور کڑی آزمائش کے مراحل آنے تک کافی عرصہ لگ جاتا ہے۔ لیکن ایسے معاشرے میں مخلص کارکنوں کی چھانٹی اور تیاری کے کام میں بہت دیر لگ جاتی ہے اس لیے کہ اقرارِ ایمان کے ساتھ جو منافئ ایمان اخلاقی بیماریاں انہیں لگی ہوئی ہوتی ہیں انہیں چُن چُن کر نکالنا نہایت مشکل اور طویل کام ہوتا ہے۔

(۴) اسلامی نظام صرف اسی معاشرے میں قائم متصور ہوتا ہے جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام اپنی پوری روح اور تفصیلات کے ساتھ نافذ ہوں اور اسے چلانے والے کارپرداز بھی اس کے پابند اور کاربند ہوں۔ اور باطل نظام وہاں قائم ہوتا ہے جہاں اور اس کے رسولؐ کے سوا دوسروں کے احکام و قوانین کا نفاذ ہو، چاہے انہیں چلانے والے نام نہاد مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ تحریکِ اسلامی کا مقصدِ وجود ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے احکام و قوانین کا اجرا کرے۔ یہی مقصد ہر مسلمان کی زندگی کا فرداً فرداً بھی متعین کیا گیا ہے۔

اسلامی تحریک اور اس کی ہم عصر دیگر جماعتیں اسلامی تحریک کے بارے میں ان چند باتوں کی وضاحت کے بعد سب سے پہلے اس کی ہم عصر جماعتوں کے بالمقابل تحریک اسلامی کے کردار کو سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ کسی جمہوری معاشرے میں باطل نظام کے اندر جہاں تحریک اسلامی بھی کام کر رہی ہو اور دوسری تنظیمیں بھی میدانِ عمل میں ہوں، ان دونوں کے فرق کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایک ہی میدان میں کام کرنے کے نتیجے میں بظاہر وہ یکساں نظر آتی ہیں اور سرسری نظر سے دیکھنے والا شخص دونوں کو اقتدار تک پہنچنے کی کوشش کرنے والی ایک ہی نوعیت کی جماعتیں شمار کر کے دونوں سے یکساں نوعیت کی توقعات باندھ لیتا ہے اور پھر نتائجِ کار کو مختلف دیکھ کر پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی معاشرے کی عام جماعتوں اور تحریکِ اسلامی میں باہمی کوئی مماثلت نہیں ہوتی۔

دونوں کی جنس ہی الگ الگ ہے اور جس طرح دریائی گھوڑے اور صحرائی اونٹ میں باہمی کوئی موازنہ نہیں کیا جاسکتا اسی طرح تحریکِ اسلامی اور دوسری جماعتوں میں بھی باہمی موازنے کے لیے کوئی شے بھی مشترک نہیں ہوتی۔ معاشرے کی عام جماعتیں غالب نظامِ باطل کی بہتر سے بہتر خدمت کا پروگرام بنا کر میدان میں آتی ہیں اور تحریکِ اسلامی اس نظامِ باطل کو اکھاڑ پھینکنے اور ایک دوسرا نظامِ حق لانے کا داعیہ لیکر اٹھتی ہے۔ اس لیے نظامِ باطل اور اس کے کارپرداز جانتے ہیں کہ ان کی فلاح و بہبود اور مستقبل کی سلامتی کس گروہ کی کامیابی میں پوشیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی ہمدردیاں فطری طور پر دوسری جماعتوں کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ پھر دوسرے درجے میں وہ عوام ہوتے ہیں جو باطل کے تحت رہتے رہتے اپنے مزاج کے اعتبار سے باطل پسند یا کم از کم باطل کو گوارا کرنے والے بن جاتے ہیں۔ جن کے مفادات باطل نظام سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ جو باطل کے ماحول، فضا اور گرد و پیش سے پوری طرح مانوس ہوتے ہیں اور ان کو ہر وہ شے غیر مانوس اور اجنبی محسوس ہوتی ہے جو رائج باطل نظام کی مخالفت یا اس سے متصادم ہوتی ہے۔ اس لیے وہ بھی تحریک کو سمجھے اور پرکھے بغیر اسی گروہ کی طرف جاتے ہیں جو اس غالب مادی نظام کی چاکری اور خدمت کے لیے آگے بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس طرح بگڑے ہوئے معاشرے میں سے تحریکِ اسلامی اپنی محنت اور ریاضت سے جو کچھ چھانٹ لیتی ہے بس وہی اس کا ہوتا ہے، باقی سب کچھ آپ سے آپ اسی نظام کا ہوتا ہے جس کے تحت یہ معاشرہ جمع ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں باطل نظام کی پروردہ اور خادم جماعتوں کو اپنے لیے بنے بنائے ووٹر، بنے بنائے عوام، بنے بنائے لیڈر اور زندگی کا ہر شعبہ بنا بنایا مل جاتا ہے۔ صرف چند ہاتھ بدل جاتے ہیں۔ دوسری طرف اسلامی تحریک کو اپنی کامیابی کے لیے سب کچھ از سرِ نو بنانا پڑتا ہے اس کی اپنی قیادت، اپنے کارکن، اپنے انداز و اطوار، اپنے مقرر اور اپنے سامعین، اپنا اندازِ بیان اور اپنا آہنگ، غرض اسے سب کچھ از سرِ نو اپنا خود ہی بنانا پڑتا ہے۔ وہ صرف ہاتھ بدلنے کے لیے نہیں اُٹھتی، پورا نظام اور اس کی تمام جزئیات بدلنے کے لیے میدان میں آتی ہے۔ گویا دوسری جماعتوں کا کام مختصر ہے لیکن اسلامی تحریک کا طویل، جان لیوا، صبر آزما اور محنت طلب کام ہے باطل نظام کی خادم تنظیموں کو جمہوری مقاصد کے لیے نعروں اور وعدوں کے زور سے صرف انتخابی فیصلے تک لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنا اور سمیٹنا ہوتا ہے۔ جبکہ ایک اسلامی تحریک کو باطل کے مقابلے میں حقائق بیان کر کے دلائل کے ساتھ سچی سچی باتوں کے ذریعے مخاطب کو قائل کر کے اپنے ساتھ ملانا ہوتا ہے۔ اگرچہ قائل ہو کر آنے والا آدمی مضبوط اور پائیدار ساتھی ہوتا ہے اور جھوٹے سچے وعدوں سے مائل ہونے والا شخص جلد ہی ایفائے وعدہ

سے مایوس ہوکر دوسری طرف لڑھک جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ قائل تو اکا دکا افراد ہوتے ہیں لیکن عوام کی نفسیات کو سامنے رکھ کر جھوٹے وعدوں کے زور سے اخلاق سے بے نیاز جماعتیں بڑے بڑے ہجوموں کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں۔

اسلامی تحریک کا اندازِ تخاطب | ا۔ نو آزاد ممالک میں جہاں معاشرہ جمہوری آداب و روایات سے مانوس نہیں ہوتا وہاں یہ بات نہایت تکرار اور اصرار سے کہی جاتی ہے کہ دھیما اور معتدل طرزِ تخاطب کامیاب نہیں رہتا۔ بعض لوگوں کے خیال میں اسلامی تحریک کے لیڈروں کی تقاریر میں بھی لب و لہجہ کی شدت بھرپور ہونی چاہیے اور عوامی اجتماعات میں شدتِ بیان کا پورا پورا حق ادا ہونا چاہیے۔ جن لوگوں کی غلطیاں بیان کی جائیں ان کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے جائیں۔ دعوت کے مخالفین کو خوب جلی کٹی سنائی جائیں۔ ان کی ایک ایک غلطی چن چن کر پوری قوت، بڑی شدت، اور بڑی حدت و حرارت سے بیان کی جائے۔ اور تقریر کے زور سے دعوت کے مخالفین کو اکھاڑ کر رکھ دیا جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے دعوتی جلسوں میں جان پڑتی ہے اور اس لب و لہجہ اور آہنگ کو لوگ پسند کرتے، سمجھتے اور شیوۂ مردانگی شمار کرتے ہیں اور جمہوریت کا منشا عوام کو اپنے ساتھ لگانا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ فکر تحریکِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی تحریک کے اندازِ تخاطب سے مکمل ناواقفیت کی علامت ہے۔ مسلمان نہ کسی کے لیے نام دھر سکتا ہے۔ نہ نا بزبالالقاب کر سکتا ہے۔ نہ جھوٹی اور مبالغہ آمیز بات کر سکتا ہے۔ اور نہ اسٹیج پر کھڑا ہوکر اداکاری کے جوہر دکھا سکتا ہے۔ اسے تو اچھے طریقے سے اچھی بات کہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ قُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْدًا۔ اگر کسی کو تحریکِ اسلامی میں آکر بھی یہی کچھ کرنا تھا تو اس کام کے لیے بہت سی دوسری جماعتوں کے پلیٹ فارم پہلے سے موجود تھے۔ گالی، نام بگاڑنا، ایکٹنگ اور بے جا شدتِ بیان تحریکِ اسلامی کے دائرۂ کار سے باہر ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے بھی اس راستے کی منزل اقامتِ دین نہیں ہے۔

دین اسلام کے مزاج سے ذرا سی واقفیت رکھنے والا اور حضور اکرمؐ اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ کی جماعت کے مزاج و اطوار سے آگاہ آدمی تحریک اسلامی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ جھوٹ کا جواب جھوٹ سے، الزام کا جواب الزام سے، بہتان کا جواب بہتان سے اور گالی کا جواب گالی سے دے۔ اسلامی تحریک تو اپنا مخصوص مزاج، اطوار، اور افتادِ طبع رکھتی ہے، اس کی اپنی فکر، زبان، اور لغت ہوتی ہے، اس کا اپنا لب و لہجہ اور اندازِ بیان ہوتا ہے۔ اس کے طرزِ عمل کے اندر سے تو خدا کا خوف اور اسلامی نظام کی

خوشبو آیا کرتی ہے۔ وہ بگاڑ کا جواب بگاڑ سے نہیں بلکہ اصلاح سے دیا کرتی ہے۔ اگر اُس کو بھی اپنے وجود سے بگاڑ ہی میں اضافہ کرنا ہو تو پھر اُسے اسلامی نظام کی خادم ہونے کا دعویٰ چھوڑ کر باطل کی خدمت میں ہی لگ جانا چاہیے جو راستہ مختصر بھی ہے اور سہل الحصول بھی۔ بلکہ پھر اسے اپنا نام بھی بدل دینا چاہیے اور اپنے دعوے سے بھی دستبردار ہو جانا چاہیے تاکہ خلقِ خدا دھوکا نہ کھائے۔

۲۔ اسلامی تحریک ان جماعتوں کی کامیابی سے نہ کبھی ذہنی مرعوبیت میں مبتلا ہوتی ہے اور نہ ان کے حربوں کی تقلید کر سکتی ہے جو لب و لہجہ کے تشدد، گالم گلوچ، الزامات و بہتانات، شخصیت کے قتل (CHARACHTER ASSASINATION) اور بڑے پیمانے پر اخلاق باختگی کا مظاہرہ کر کے، جبر و تشدد، دھاندلی، غیر اخلاقی حربوں، اور جوڑ توڑ سے اقتدار پر قبضہ کرتی ہیں۔ سیاسی کامیابی کا یہ راستہ اسلامی تحریک کا راستہ نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ وہ تو دعوتِ اسلامی کے لیے اخلاقی طریقے اور اسلامی آدابِ جدوجہد ہی اختیار کر سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جاہلی تحریکوں کے سے انداز اختیار کر کے اگر کوئی اسلامی تحریک کامیابی حاصل کرے تو وہ کامیابی سرے سے تحریکِ اسلامی کی کامیابی ہی نہ ہوگی بلکہ وہ تو اس کی ناکامی ہے۔ یہ طور طریقے اختیار کرنے کے بعد پھر وہ تحریکِ اسلامی ہی کہاں باقی رہ جائیگی؟ دنیا کی عظیم ترین تحریکِ اسلامی کو جو خدائی ہدایات دی گئی تھیں اور جن ہدایات کی پابند ہر دور کی ہر اسلامی تحریک ہے، ان کی روشنی میں تو کافر دن تک کو وقت کا نبی "اے میری قوم" "اے میری قوم کے اکابر" کہہ کر خطاب کرتا ہے اور اسے واضح ہدایت ہے کہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل ۱۲۵) "اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے سے جو بہترین ہو۔"

ظاہر ہے کہ تحریکِ اسلامی جس اسلامی دعوت کی علم بردار ہے اس دعوت کو فریضہ قرار دینے والے مالک الملک نے اِس دعوت کو پیش کرنے کا طریقہ بھی خود ہی بیان کر دیا ہے۔ اور اس مخصوص طریقے کے سبب اسلامی تحریک دوسری سب جماعتوں سے ممتاز اور نمایاں قرار پاتی ہے۔ یہ طریق چھوڑ دیا جائے تو پھر دنیدار قسم کے لوگوں کا ایک جھنجھلایا ہوا گروہ تو باقی رہ جاتا ہے جو غم و غصہ سے بھرا ہوا جو کلمہ منہ میں آتا ہے کہے جاتا ہے لیکن وہ اپنے مزاج اور طریقۂ کار کے لحاظ سے تحریکِ اسلامی نہیں رہ جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل دعوتِ اسلامی

کو بٹہ لگانے کے مترادف شمار ہوگا۔ خدا کے ہاں اپنی کہی ہوئی ایک ایک بات کی جواب دہی سے بے خوف واعظین اور مقررین کے گروہ کو اسلامی تحریک کے کارکن کہنا مشکل ہوگا۔ ان کی پیش کی ہوئی دعوت کو دعوتِ اسلامی کہنا دشوار رہو گا۔ اور ان کے لائے ہوئے نظام کو اسلامی نظام سمجھ کر اس سے فلاحِ انسانیت کی امیدیں وابستہ کرنا بھی خام خیالی ہوگا

صبر کا طویل راستہ | درحقیقت اسلامی دعوت کا راستہ بیحد صبر آزما اور بہت طویل ہے۔ جسے عجلت ہو اور جس کے لیے صبر بھی مشکل ہو اسے یہ راستہ بالعموم راس نہیں آتا۔ ہر راستے کے لیے زادِ راہ ہوتا ہے اور اس راستے کا زادِ راہ ہی درحقیقت صبر اور توکل علی اللہ ہے۔ حسن البنا شہیدؒ نے اپنے ساتھیوں کو تلقین کرتے ہوئے کیا خوب بات کہی تھی۔

"آپ کا راستہ ایک متعین راستہ ہے۔ مجھے پورا اطمینان ہے کہ یہ منزل تک پہنچنے کا سب سے زیادہ محفوظ راستہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح آپ کا راستہ بہت طویل ہو جائے گا۔ لیکن اس کے سوا دوسری کوئی صورت بھی نہیں ہے۔ مردانگی تو صبر، کوشش اور مسلسل اور خاموش کام میں ہی ہے۔ جو کوئی پکنے سے پہلے ہی پھل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے وہ وقت سے پہلے ہی پھول توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس جلد بازی کے حق میں نہیں ہوں جس کو جلدی ہو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اس صبر آزما دعوت کو چھوڑ کر دوسری جماعتوں کا رخ کرے جہاں اس کے جذبہ عجلت پسندی کی تسکین کا سامان ہو سکتا ہے۔ جو ہمارے ساتھ صبر سے کام لیتا ہے اس کا اجر اس کے اللہ کے پاس ہے جو ضائع ہونے والا نہیں ہے۔ پھر یا تو کامیابی و کامرانی قدم چومے گی یا ہم مرتبہ شہادت و سعادت سے بہرہ مند ہونگے۔"

دعوت کے اس سارے کام میں جو بات کسی لحظہ فراموش نہیں کی جا سکتی وہ یہ ہے کہ ہم کس کا کام کر رہے ہیں؟ اور جس کا کام کر رہے ہیں وہ ہمارے اس کام سے باخبر ہے یا بے خبر ہے؟ اور باخبر ہے تو وہ غالب ملکوں کا مالک، اور اجر دینے پر قادر ہے یا نہیں ہے؟ اگر غالب وہی ہے تو پھر وہ جب چاہے گا کامیابی کا راستہ کھول دیگا۔ مزدور کا کام تو یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کا کام اپنی مزدوری کی ضمانت کے ساتھ برابر کرتا رہے اور ظاہر ہے کہ مالک الملک کا کام کرنے والوں کے لیے مزدوری کی ضمانت موجود ہے۔

صبر کے اس طویل راستے کی طرف خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رہنمائی فرمائی ہے حضورؐ

صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے پرصعوبت ماحول میں کئی برس تک دعوتِ اسلامی پیش فرماتے رہے اور ہر طرف سے انکار و نکرار پہ اصرار ہوتا رہا۔ ایک روز حضورؐ دیوار کعبہ سے ٹیک لگائے تشریف فرما تھے اتنے میں حضورؐ کے ایک جاں نثار ساتھی جن کے مصائب زبان زدِ عام تھے تشریف لائے اور اسلامی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے ایک مشہور و معروف سوال کیا۔ وہ زخموں سے چُور، گریبان چاک، تشدد کا نشانہ مجسم سوالیہ نشان بنے ہوئے کھڑے تھے "حضورؐ اسلامی نظام کب آئے گا مصیبت کے یہ دن کب کٹیں گے؟"۔

یہ سوال سُن کر حضورؐ کا چہرۂ مبارک تمتما اٹھا جیسے حضورؐ کو اپنے جان نثار ساتھی کا یہ کلمہ ناگوار گزرا ہو حضورؐ دیوارِ کعبہ کی ٹیک چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا:

" ارت کے بیٹے خبّاب، ابھی سے گھبرا گئے تم سے پہلے جن لوگوں نے یہ کام کیا ان میں سے بعض کو تو لوگوں نے گڑھے کھود کر زمین میں گاڑ دیا اور پھر آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا۔ اور بعض کو گاڑ کر لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت اور ہڈیاں الگ کر دیئے۔ اور تم ابھی سے گھبرا گئے ہو"

اور پھر وقفہ کے بعد فرمایا:

" ایک وقت آئے گا جب اللہ کا دین سربلند ہوگا اور ایک معمولی عورت بھی ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سونا اُچھالتی چلی جائیگی۔ لیکن تم تو بے صبری کرتے ہو"

صبر، مسلسل کام، آزمائش میں ثابت قدمی، مخالفین کے مقابلے میں شرافت، گالیوں کے بدلے میں دعائیں۔ اللہ کے دین کی اس راہ کا مسافر یہ زادِ راہ ہر دور میں لے کر چلتا رہا ہے۔ تاریخ انسانی کے جس دور میں بھی کسی نے دعوتِ اسلامی کو اپنی منزل بنایا اور رضائے الٰہی کو اپنا مقصودِ زندگی ٹھیرایا اس کا یہی طرزِ عمل رہا ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک سے ترمذی نے روایت کی ہے کہ

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آزمائش جتنی سخت ہوگی اتنا ہی بڑا انعام ملے گا۔ بشرطیکہ آدمی مصیبت سے گھبرا کر راہِ حق سے بھاگ نہ کھڑا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو مزید نکھارنے اور صاف کرنے کے لیے آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ پس جو لوگ اللہ کے فیصلے پر راضی رہیں اور صبر کریں تو اللہ ان سے خوش ہوتا ہے اور جو لوگ اس آزمائش میں اللہ سے ناراض ہوں تو اللہ بھی ان سے ناراض ہوتا ہے"۔

اس راستے میں بدی کو بھی نیکی سے رفع کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ فرمایا:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (حٰم السجدۃ ۳۴) "نیکی اور بدی یکساں نہیں

ہیں تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔"

صبر و حکمت اسلامی تحریک کا بنیادی طرزِ عمل ہے۔ تحریک کا دَورِ تیاری سخت آزمائشوں سے بھرپور ہوتا ہے اور اس دَور میں تحریک کے ہر کارکن کے لیے یہی حکم ہے کہ وہ ہر مصیبت کے مقابلے میں صبر سے کام لے اور مستقل مزاجی سے اپنے طریقے پر قائم رہے۔ حضورؐ نے اپنے ایک ساتھی سے خود فرمایا کہ اسلام کے سلسلے میں سب سے جامع بات یہ ہے کہ:

قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (مشکوٰۃ) "آمنت باللہ کہو اور پھر اس پر جم جاؤ۔"

حضورؐ کی اسلامی تحریک کا مکی دَور اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ بڑے بڑے جوانمردانِ اسلام جنہوں نے بعد میں روم و ایران کو فتح کیا اور قلعۂ خیبر کے دروازے کو اپنی قوتِ بازو سے اکھاڑ دیا، جنہوں نے بدر کے اندر کفار کے پہلوانوں کو ککڑی اور کھیرے کی طرح کاٹ کر رکھ دیا، وہ مکے کی گلیوں میں گھسیٹے، مارے اور لہولہان کیے گئے لیکن صبر کی مُہر ان کے لبوں پر اور استقامت کی قوت ان کے قدموں میں قائم رہی۔ اس لیے کہ ابھی تربیت و تیاری کے مراحل باقی تھے اور انہیں ابھی مزاحمت کا حکم نہ ملا تھا۔ ابھی سونے کو تپا تپا کر کندن بنایا جا رہا تھا۔ ابھی باطل سے طاقت آزمائی کے لیے متوازن اور مناسب طاقت جمع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ انہی دنوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ساتھی کو گزشتہ دَور کے ایک نبی کا قصہ سنایا جس قصے میں خود حضورؐ کی اپنی تمثیل موجود تھی۔ حضورؐ نے فرمایا۔

"وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ دعوت دینے کے جُرم میں ایک نبی کو اتنا مارا گیا کہ لہولہان کر دیا گیا اور نبی کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے اور یہ کہتے جاتے اے اللہ میری قوم کے اس جرم کو معاف کر دے، یہ ناواقف لوگ اصل حقیقت کو نہیں جانتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مکے سے مدینے کی نقل مکانی نے اس عظیم اسلامی تحریک کے سامنے دَورِ ضعف اور دَورِ قوت یا دوسرے الفاظ میں عدمِ مزاحمت اور مزاحمت کے فرق کو پوری طرح نمایاں کر دیا اور مدینے کی نقل مکانی باطل کے مقابلے میں مزاحمت کی واضح علامت بن کر سامنے آگئی لیکن جب ایسی کوئی واضح علامت کسی تحریک کے سامنے موجود نہ ہو تو اسے قوت کے ذریعے مزاحمت کا فیصلہ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا لازم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تحریکِ اسلامی کوئی ایسا کھلونا نہیں ہوتی جیسے بچے کی طرح جب چاہے ٹکرا کر توڑ پھوڑ دیا جائے اور جب دل چاہے بنا لیا جائے۔ یہ ایک ایسی امانت ہے جو صدیوں کے بعد کسی مخلص مسلم گروہ کے

حوالے ہوتی ہے۔ اور اس کی قیادت حکمت و دانائی سے اور اس کی پیروی صبر و استقامت سے کی جاتی ہے۔
اسلامی تحریک کے ساتھ چلنے والوں کو مخاطب کر کے اس راہ میں صبر و استقامت کی تلقین کرتے ہوئے خود خالقِ کائنات نے فرمایا:

"اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۔ (البقرہ ۲۱۴)

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں مصیبتیں آئیں۔ وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی؟ (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔"

ہمارے دور کے عظیم قائدِ تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۶۳ء میں ایک جابر حکومت کے جبر و تشدد کی چلتی ہوئی گولیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا:

"میرے عزیز ساتھیو، اللہ کے دین کے لیے جس کو کام کرنا ہو اس میں دو صفتیں ضرور ہونی چاہییں ایک صبر۔ دوسرے حکمت۔ صبر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی راہ میں جو رکاوٹ بھی ڈالی جائے اس پر نہ تو مشتعل ہو کر آپ ذہن کا توازن کھو بیٹھیں اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنے مقصد کے بجائے رکاوٹ ڈالنے والوں کا مقصد پورا کریں، بلکہ ہر رکاوٹ پیش آنے پر آپ کا عزم جوں کا توں قائم رہنا چاہیے اور جذبات کی گرمی سے اپنے دل و دماغ کو محفوظ رکھ کر آپ کو وہ راہ اختیار کرنی چاہیے جو حکمت کے مطابق ہو"

پھر آگے چل کر حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا

"حکمت یہ ہے کہ آپ بس ایک ہی لگی بندھی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے کے عادی نہ ہوں بلکہ آپ میں یہ صلاحیت ہو کہ ایک راستہ بند ہوتے ہی دس دوسرے راستے بروقت نکال لیں۔ جس شخص میں حکمت نہیں ہوتی وہ ایک راہ کو بند پا کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے ساتھ اگر بے صبر بھی ہو، تو پھر یا تو اس رکاوٹ سے اپنا سر پھوڑ لیتا ہے یا راہ روی سے ہی باز آ جاتا ہے۔ مگر جسے اللہ نے حکمت اور صبر دونوں سے نوازا ہو وہ جوئے رواں کی طرح ہوتا ہے جس کی منزل کوئی چیز بھی کھوٹی نہیں کر سکتی۔ چٹانیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور

دریا کسی اور طرف سے اپنی منزل کی طرف بہ نکلتا ہے۔"

پھر بند راستوں کے مقابلے میں کام کے دوسرے راستوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "ہمارے لیے اپنا پیغام پہنچانے اور اپنی دعوت پھیلانے کی بس یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ہم جلسوں میں تقریریں کریں اور ہزاروں آدمی انہیں سُنیں۔ یہ تو کام کی ایک صورت ہے۔ آپ تین تین چار چار آدمیوں کے وفود کی شکل اختیار کر کے علاقے میں پھیل جائیں۔ گھر گھر، دکان دکان اور مسجد مسجد جائیے۔ فرداً فرداً لوگوں سے ملیے۔ ایک ایک شخص کو بتائیے کہ جماعت اسلامی کیا ہے، اس کا نظام کیا ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کا طریقِ کار کیا ہے، وہ کن چیزوں کی اصلاح کرنا چاہتی ہے اور کن بھلائیوں کو قائم کرنا چاہتی ہے ------ جو لوگ بحث میں اُلجھنے کی کوشش کریں ان سے اُلجھے بغیر گزر جائیے۔ آپ کا طریق اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ کی ربانی ہدایت کے مطابق ہونا چاہیے۔ آپ کی زبان شیریں ہو۔ آپ کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔ آپ کا برتاؤ شریفانہ ہو۔ آپ بُرائی کا جواب بھی بھلائی سے دیں اور اپنی زبان ہی سے نہیں اپنے رویّے سے بھی یہ ثابت کر دیں کہ آپ فی الواقع بدی کی جگہ نیکی قائم کرنے والے ہیں۔ اس کے بعد یقین رکھیے کہ اللہ کی رحمت آپ کے ساتھ ہو گی اور جتنا کام آپ کریں گے اس سے زیادہ کام اللہ کے فرشتے آپ کے ساتھ مل کر کریں گے۔"

اب آپ دورِ نبوت کی اسلامی تحریک میں سے حکمت کی مثال لیجیے۔ یہ مثال صلح حدیبیہ ہے۔ کفار مزاحمت پر آمادہ ہیں۔ مسلمانوں کی طاقت اپنی تعداد، حالات، محلِ وقوع اور سروسامان کے لحاظ سے ناکافی ہے، اور تبلیغِ دین کے لیے نئے نئے راستے نکالنے کی ضرورت ہے۔ قائدِ تحریک کفّار کی مزاحمت پر طرح دے جاتے ہیں۔ بعض شرائط صلح بظاہر مسلمانوں کو ناپسند ہیں اور کمزوری کا نشان نظر آتی ہیں۔ لیکن قائدِ تحریک آئندہ کے وسیع تر تبلیغی امکانات پیدا کرنے کے لیے صلح اور مصالحت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ قرآن صلح و مصالحت کی اس کارروائی کو فتحِ مُبین قرار دیتا ہے اور واقعی وہ فتحِ مبین بن کر رہتی ہے۔ تحریک کو ایک بڑے دشمن کے ساتھ مستقل تصادم سے چند دنوں کے لیے نجات مل جاتی ہے جس سے

---

[1] واضح رہے کہ اُس وقت کُل پاکستان جماعت اسلامی کے اجتماعِ عام کے عین موقع پر حکومت نے یکایک ایک آرڈی ننس جاری کر کے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ممنوع کر دیا تھا۔ اس لیے عام جلسوں کا سارا پروگرام ملتوی کرنا پڑا اور امیر جماعت نے فوراً دوسرا پروگرام بنا دیا جو عام جلسوں کی بہ نسبت زیادہ مفید و مؤثر ثابت ہُوا۔

فائدہ اٹھا کر متعدد چھوٹی بڑی فتوحات، قبائل سے معاہدات اور تبلیغ کے ذریعے تحریک کے لیے کامیابی کے بے شمار دوسرے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

جوش و جذبہ اور حکمتِ کار کا باہمی تعلق متوازن اور معقول ہو تو تحریک کا کام بڑھتا ہے جوش و جذبہ نہ ہو صرف حکمت ہو، تو راستہ زیادہ طویل اور سفر زیادہ بوجھل ہو جاتا ہے۔ صرف جوش و جذبہ ہو اور حکمت نہ ہو تو تحریک راستے میں آنے والی کسی بھی چٹان سے سر پھوڑ کر ختم ہو جاتی یا میلوں دُور چلی جاتی ہے۔ جوش و جذبہ کی مثال پٹرول کی سی ہے۔ پٹرول کے ڈرم کو یک وقت آگ لگا دیجیے تو وہ تباہی کا سامان ثابت ہو گا۔ اور گاڑی کے انجن میں ڈال کر تھوڑا تھوڑا کنٹرول کے ساتھ استعمال کیجیے تو طویل منزلیں بھی مختصر ہوتی چلی جائیں گی۔

اسلامی تحریک کے کارکن اس مرحلہ پر یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ کیا ہر اجتماعی جدوجہد کے لیے ایک ہی طرز کے پُرجوش، فعال، متحرک اور جاندار کارکن کام دے جاتے ہیں یا ہر تحریک اپنے لیے اپنی طرز کے مخصوص کارکن تیار کرتی ہے اور اپنے مطلوبہ نظام کو لانے اور اپنے متعین مقصد تک پہنچنے کے لیے علیحدہ علیحدہ قسم کے کارکن تیار کرتی ہے؟ اس بات کا جواب بہت آسان ہے۔ اشتراکیت ایک معاشی تحریک ہے۔ اس کے لیے وہی لوگ درکار ہیں جو زندگی کے ہر مسئلے کو روٹی کپڑا اور مادی مفاد کی نظر سے ہی دیکھیں، اس کے سوا مسائل کو پرکھنے کا کوئی دوسرا پیمانہ وہ قبول نہ کریں اور اُس مزاج اور کردار کے سانچے میں ڈھلے ہوتے ہوں جو اشتراکی نظام آدمی کو دیتا ہے۔ اسی طرح ہر ملک کی سیاسی جماعتوں کا واحد مقصد حصولِ اقتدار ہی ہوتا ہے اور وہ ہر مسئلے کو اسی نظر سے دیکھتی ہیں کہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے مختصر ترین راستہ کون سا ہے تاکہ موجودہ نظام کی مذمت اور اپنے کارکنوں کو سیاسی فائدہ پہنچانے کا کام وہ کر سکیں۔ اس کے مقابلے میں اسلامی تحریک اپنی فکر اور مزاج کے لحاظ سے ایک اخلاقی تحریک ہے۔ وہ اپنے کارکنوں میں اسلام کا فہم اور اسلام کی اطاعت اور اس پر عمل کا اہتمام پیدا کیے بغیر ان سے کوئی مثبت کام نہیں لے سکتی۔ اور ایسے لوگ جو ان باتوں سے اپنی عملی زندگی میں عاری ہوں، چاہے وہ کتنے ہی پُرجوش نعرے اسلام کے حق میں لگائیں، ان کے ہاتھوں سے اُسی طرح اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکتا، جس طرح ہمارے ملک کو قائم کرنے والی جماعت۔ اسلامی نظام قائم کرنے میں ناکام رہی۔ حالانکہ اس کا نعرہ پاکستان کو اسلامی ریاست ہی بنانے کا تھا۔

ہر تحریک اپنا ایک مزاج رکھتی ہے۔ جو شخص اسلامی تحریک کے ساتھ اس لیے چلا آیا ہے کہ یہاں وہ اپنے

معاشی مفادات کا سب سے پہلے تحفظ کر سکے وہ یہاں ہر چیز کو معاشی نقطۂ نظر سے ہی دیکھے گا اور طبقاتی کشمکش کا ماحول بنا کر ذرائع پیداوار پر قبضہ کرنے کی اسکیم ہی بنائے گا۔ ایسا کارکن اسلامی تحریک کے کام نہیں آسکتا۔ جس کارکن کا مقصد اقتدار پر قبضہ کر کے سیاسی اور مادی مفادات کا جلد از جلد حصول اور اپنے ساتھیوں کو اعلیٰ مناصب تک پہنچانا ہو اس کا مقام بھی اسلامی تحریک میں نہیں بلکہ ملک کی کسی دوسری سیاسی جماعت ہی میں ہو گا۔ البتہ جس شخص کا مقصد اسلامی نظام کو اس کی ساری برکات کے ساتھ نافذ کرنا اور اس جدوجہد کو اپنے خدا کے پاس اپنا کارنامہ زندگی بنا کر پیش کرنا ہو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ مطالعۂ لٹریچر کے ذریعے پہلے تحریک اسلامی کو سمجھے، اس کی تاریخ پر نظر ڈالے، اس کے داعی کے کردار اور اس کی ساری جدوجہد کا مطالعہ کرے، اس تحریک کا اصل مقصدِ وجود جاننے اور اسلامی نظام قائم کرنے والے کارکنوں کی طرح اسلامی نظام کے تمام تقاضوں کو اپنی انفرادی زندگی بول چال، گفتگو، چال ڈھال غرض ہر چیز میں نمایاں کرے۔ یہاں تک کہ اس کو دیکھ کر ہی ہر شخص کہہ سکے کہ اس شخص کا تعلق لازماً تحریک اسلامی سے ہے۔ درحقیقت اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے کارکن ہی اسلامی نظام قائم کر سکتے ہیں۔ اور اس سانچے کو توڑ کر خود اپنی ہی خواہشات کے سانچے بنانے اور ان میں ڈھلنے والے کارکن شاید اور تو کچھ کر سکیں لیکن اسلامی نظام کی تعمیر و تشکیل کا کام ہرگز نہیں کر سکتے۔

اسلامی تحریک کے لیے اسلامی کردار کے کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جو لوگ بھی کسی معاشرے میں اسلامی تحریک سے وابستہ ہوتے ہیں ان کی اسلامی تربیت ناگزیر ہوتی ہے۔ تربیت کا یہ کام نئے کارکنوں کی نفسیات کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ جس طرح سے طبیب ایک ہی بوتل میں سے ہر مریض کو دوا نہیں دیتا اسی طرح ایک ہی لگے بندھے طریقے سے مختلف کارکنوں کی تربیت بھی ممکن نہیں ہوتی۔ اس کے لیے حکمت اور نفسیاتی طریق کار کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ توحید اور اس کے لازمی تقاضوں سے آگاہی، خالص للہیت پر مبنی کام، اپنی زندگیوں میں سے غیر اللہ کی ہر نوعیت کی فرماں روائی کا خاتمہ، رسالت اور اس کی ہمہ گیر رہنمائی کو قبول کرنا، آخرت کا تصور اور اس میں جوابدہی کا مکمل شعور۔ یہ چیزیں تربیت کا اوّلین تقاضا ہیں۔ اس سلسلے میں داعیٔ تحریکِ اسلامی نے تربیت کارکنان کے لیے بڑی عمدہ رہنمائی کی ہے۔

"آپ باہر کی مخالفتوں کی فکر نہ کریں بلکہ ساری فکر اپنی کمزوریوں کو رفع کرنے کی کریں۔ اللہ سے اپنا تعلق بڑھائیے۔ اللہ سے محبّت اور اس کا خوف دل میں جاگزیں کیجیے۔ ریا، فخر، نمود و نمائش اور خود غرضی

سے نیچیے۔ جو کچھ کیجیے خلوص قلب کے ساتھ خالص اللہ کے لیے کیجیے اور اسی سے اجر کی اُمید رکھیے۔ دنیا میں آپ کی محنتوں اور کوششوں کا کوئی پھل بھی آپ کو نہ ملے بلکہ اُلٹا نقصان بھی ہو تب بھی بدی کو مٹانے اور نیکی کو قائم کرنے کے لیے جان، مال، وقت، قابلیت کسی چیز کو کھپا دینے سے دریغ نہ کیجیے۔ آپس کے بغض اور کدورتوں کو دل سے نکال دیجیے اور محبت و خیر خواہی سے اپنی جماعت کے اندرونی رخنوں کو بھر کر ایک بنیانِ مرصوص بن جائیے۔ جماعت میں جو خرابی بھی کہیں پیدا ہو اس میں دوسروں کا قصور ڈھونڈنے کے بجائے یہ سوچیے کہ آپ کا اپنا قصور کیا ہے۔ آپ میں سے ہر شخص جب اپنے اپنے قصوروں کا تدارک اور اپنے اپنے فرض کو ادا کرے گا تو سب ہی کے قصوروں کا ایک ساتھ تدارک ہو جائے گا۔ اور جماعت کے قدم اس سے زیادہ تیز چلیں گے جتنے اب ہماری کوتاہیوں کے باوجود تیز ہیں۔" (باقی)

(بقیہ مطبوعات)

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے جیل کی چار دیواری سے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو تحریر کیے۔ ان خطوط کے ایک ایک لفظ سے ڈاکٹر صاحب کی خدا سے غیر معمولی محبت، اُس کی رحمت پر کامل بھروسہ، جس مسلک کو اُنہوں نے اختیار کر رکھا تھا اُس کے برحق ہونے کا پورا یقین اور اس کے لیے ہر قسم کے ایثار کا جذبہ پوری طرح جھلکتا ہے۔ جو شخص بھی ان خطوط کو پڑھتا ہے اُس کے اندر ایمان کی حرارت اور اللہ کے دین کو سربلند کرنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہم تمام پڑھے لکھے مسلمانوں، بالخصوص اقامتِ دین کی جدوجہد میں شریک ہونے والے سب حضرات سے ان کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ اس فرض کو کس عزم، حوصلے، تدبر اور یکسوئی کے ساتھ ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ فرض انسان سے کس قسم کی قربانی کا طالب ہے۔

کتاب کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کی کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ البتہ کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔

مطبوعات

سقوطِ مشرقی پاکستان | تالیف : جناب صفدر محمود صاحب۔ شائع کردہ : مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲۔
قیمت ۱۰ روپے۔ صفحات ۲۰۵۔

دنیائے اسلام کے لیے بالعموم مگر پاکستان کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص سقوطِ مشرقی پاکستان اس صدی کا بہت بڑا المیہ ہے۔ فاضل مصنف نے اس المیے کے پس منظر کا دقتِ نظر سے جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ یہ اُفتاد کوئی ایسی آسمانی بجلی نہ تھی جو آنًا فانًا چرخِ نیلی فام کے دامن سے نمودار ہو کر ملک کی سالمیت کو برباد کرنے کا باعث بنی ہو بلکہ عرصہ دراز سے اس ملک کے سیاسی اُفق پر خطرات کے جو بادل منڈلا رہے تھے وہ اس بات کی برابر نشاندہی کر رہے تھے کہ اس ملک کو کوئی بہت بڑا خطرہ پیش آنے والا ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں پاکستان کے تاریخی پس منظر سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء کے واقعات پر مشتمل ہے پاکستان کے اندر ہونے والی محلاتی سازشوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ چوتھے باب میں علیحدگی کے رجحانات اور وطن دشمن عناصر کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں ایوب خان کے دورِ حکومت اور چھٹے باب میں یحییٰ کے دورِ حکمرانی سے بحث کی گئی ہے۔ آخری باب میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مشرقی پاکستان پر کیا گزری، کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے۔

فاضل مصنف کا انداز بیان دلکش اور مدلل ہے اور اُس کے جائزے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس نے سارے واقعات کا ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا ہے۔ پاکستان کے بارے میں اگر اس نقطۂ نظر کو سامنے نہ رکھا جائے تو حالات کے مطالعے میں کبھی حقیقت پسندی اور معروضیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ پاکستان اسلام کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا ہے اور اگر یہ بنیاد ہی نظر انداز کر دی جائے تو عمارت کا جائزہ کسی طرح بھی صحیح نہیں لیا جاسکتا۔

کتابت اور طباعت کا معیار عمدہ ہے۔

ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات | تالیف مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہرویؒ - جمع و ترتیب: مولانا محمد حنیف یزدانی - ناشر: مکتبہ نذیریہ الپتگین سٹریٹ ۳، اچھرہ - لاہور - صفحات ۲۴۴ - قیمت ۹ روپے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں اس نیم برِّ اعظم میں مسلک اہلِ حدیث کے بزرگوں کی علمی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے کتاب بڑی معلومات افزا ہے اور اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک مسلک کے علماء نے دینِ حق کی ترویج و اشاعت کے لیے کتنا عظیم کام سر انجام دیا ہے۔ ایک بات البتہ ضرور کھٹکتی ہے کہ اس میں بعض ایسے بزرگوں کے نام شامل ہیں جنہیں اصطلاحی معنوں میں اہلِ حدیث نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً خواجہ عبدالحی فاروقی مرحوم و مغفور کو اہلِ حدیث علماء میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ اُن کا تعلق اہلِ احناف سے تھا۔ راقم الحروف کو اُن کے ساتھ کئی برس کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور وہ ذاتی معلومات کی بنا پر یہ بات کہہ سکتا ہے یہی بات بعض دوسرے بزرگوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

کتاب کے آخر میں فاضل مُرتّب نے ایک ضمیمہ شامل کیا ہے جس میں اہلِ حدیث کی اُن دینی خدمات کا مختصر تعارف ہے جو انہوں نے تقسیم کے بعد پاکستان میں سر انجام دیں۔

اسلاف کے ان علمی اور دینی کارناموں کی اچھی طرح اشاعت ہونی چاہیئے تاکہ نئی نسلوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ یہ اُمّت علمی اعتبار سے بانجھ نہیں بلکہ اس میں ہر عہد کے اندر بہت بڑی تعداد میں ایسے اصحابِ فضیلت پیدا ہوتے رہے ہیں جو علمی وجاہت کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور پرہیزگاری میں بھی نہایت اُونچا مقام رکھتے تھے۔ کتاب کا معیارِ طباعت و کتابت گوارا ہے۔

لبِ زنداں | ڈاکٹر نذیر احمد شہیدؒ کے خطوط کا مرقع - مرتبہ: جناب محمد خالد فاروق - شائع کردہ: ادارۂ افکارِ نو، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۷۶، لاہور - ہدیہ سات روپے، صفحات ۲۸۴۔

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم و مغفور اس ملک کے عام باشندوں اور خصوصاً تحریکِ اسلامی کے وابستگان کے لیے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کی للّٰہیت، خلوص، شرافت، اسلام اور بنی نوعِ انسان کے لیے غیر معمولی جذبۂ خدمت و ایثار ہر اُس شخص کے سینے پر ثبت ہے جسے کبھی بھی اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک مردِ مومن کی طرح راہِ حق میں بڑے استقلال اور پاکیزہ اخلاق کے ساتھ زندہ رہے اور مردِ مومن کی سی یکسوئی اور فراست کے ساتھ اسلام کی سربلندی کے لیے بھرپور کوشش کرتے رہے اور بالآخر اپنی اس حق پرستی کی وجہ سے دشمن کی گولی کا نشانہ بن کر اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

(بقیہ اشارات)

نیک مقاصد ہمیشہ نیک ذرائع ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اگر اچھے مقاصد کی تکمیل کے لیے ناپاک اور تخریب پسندانہ ذرائع استعمال کیے جائیں تو ان سے مقاصد کی عظمت، تقدیس اور پاکیزگی کو نقصان پہنچتا ہے۔ چونکہ غلبۂ حق ایک نہایت ہی پاکیزہ مقصد ہے اس لیے اس کے حاصل کرنے کے ذرائع بھی اتنے ہی پاکیزہ ہونے چاہییں۔ تشدد اور فتنہ و فساد کی راہ سے لائے ہوئے انقلابات فتنوں کا دروازہ تو کھول سکتے ہیں مگر فتنوں کا سدِ باب کر کے کسی پائدار تعمیری اور حیات آفریں انقلاب کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔

دعوتِ حق کا کام بڑے دل گردے کا کام ہے اس لیے اس طرف اُن لوگوں کو ہی بڑھنا چاہیے جو حکمت اور دانائی کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ اور عزم و ہمت کے ساتھ اس جد و جہد میں شریک ہونے کا داعیہ رکھتے ہوں:-

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝

بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ برائی کا جواب ایسے طریقے سے دو جو احسن ہو، اس طرح تمہارا دشمن بھی تمہارا گرمجوش دوست بن جائے گا اور یہ چیز ان لوگوں کو ملا کرتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں اور انہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیبے والے ہیں۔

میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان جیسے محترم اور درویش صفت انسان کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک جیل میں کیا گیا ہے اُس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ میاں صاحب پر تشدد، اخلاق و شرافت کی تذلیل اور زندگی کی اعلیٰ و ارفع اقدار کی شرمناک توہین ہے۔ جو لوگ اس گھناؤنے فعل کے ذمہ دار ہیں ہم ان سے کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک انہوں نے یہ مذموم حرکت جان بوجھ کر اس پست سطح پر اُتر کے کی ہے جو درندگی کی سطح ہو تو ہو انسانیت کی سطح بہرحال نہیں ہو سکتی۔ اگر ان میں انسانیت کی کوئی معمولی رمق بھی ہوتی تو وہ اس مردِ حق آگاہ کو۔۔۔جس کی ڈاڑھی کو میں نے خود کئی مرتبہ خدا کے خوف میں

بہائے جانے والے آنسوؤں سے تر دیکھا ہے ــــ کبھی ہاتھ نہ لگاتے ـ یہ لوگ اِن دنوں جس قسم کی حرکتیں کر رہے ہیں ان کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صبر و ثبات کا وہ پہاڑ جس کی زبان سے ہم میں سے کسی نے کبھی آج تک بد دعا کا ایک لفظ نہیں اس کے دل سے بھی ان کے لیے بد دعا نکلی ہے ـ ہم بڑے دُکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر اُن ظالموں کے عبرتناک انجام سے ــــ جن میں سے کئی ایک کا حشر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں ـ کوئی سبق نہیں سیکھا ـ اس لیے انہیں معقولیت کا کوئی رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دینا ہمارے نزدیک بیکار ہے ـ البتہ ایک بات ہم پُورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں، اُسی وثوق کے ساتھ جس سے کوئی انسان یہ کہے کہ رات کی تاریکی کے بعد لازمی طور پر دن کی روشنی ہو گی کہ جن لوگوں نے میاں صاحب اور جاوید ہاشمی اور دوسرے بے گناہ افراد خصوصاً نوجوان طالب علموں کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا ہے ان کا آخرت میں جو انجام ہو گا وہ تو ہو گا قادرِ مطلق انہیں دنیا میں بھی سامانِ عبرت بنا دے گا ـ خدا کا عذاب ان پر اِس طرح محیط ہو گا کہ انہیں کہیں جائے فرار نہ ملے گی ـ

میاں صاحب کے ساتھ یہ سلوک اور جماعت کے دوسرے زعماء کی گرفتاریوں اور اسلامی ذہن رکھنے والے طلبہ کو حوالۂ زنداں کرنے کی ناپاک کارروائیوں کو دیکھتے ہوئے برسرِ اقتدار طبقہ کے عزائم کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ـ اس مرحلے پر ہم اسے ایک بات کسی غرورِ نفس کے جذبے سے نہیں بلکہ رحمتِ باری تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کوئی ایسی جماعت نہیں جسے آپ قید و بند کی صعوبتوں سے ڈرا کر منتشر کر سکیں ـ اس کا جس قادرِ مطلق پر انحصار اور اعتماد ہے وہ سب سے زیادہ قوی اور طاقتور ہے ـ اور جماعت کے سارے وابستگان کو اس بات کا پُورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کی ساری کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود انہیں تہ و بالا ہونے سے بچائے گا جس طرح کہ اُس نے پہلے بھی بچایا ہے ـ یہ البتہ اگر مشقِ ناز کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو یہ بھی کر کے دیکھ لیں ـ

هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ـ

ٹیلیفون نمبر ۵۲۵۰۷ **ادارہ معارف اسلامی (رجسٹرڈ)** رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰
منصورہ ○ لاہور ○ پاکستان

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن

ہمارے درج ذیل ایجنٹ حضرات سے دستیاب ہو سکتی ہے:-

۱- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکٹ لاہور
۲- فیروز سنز لمیٹڈ، دی مال، لاہور-
۳- مکتبہ تنویر القرآن اُردو بازار لاہور
۴- میسرز تاج کمپنی لمیٹڈ، بندر روڈ کراچی
۵- نورسنی پبلیکیشنز، لیاقت آباد کراچی-
۶- مکتبہ تعمیر افکار اسلامی بالائی منزل حسین ڈیکوریشن ناظم آباد کراچی
۷- شیخ سنز، اُردو منزل، اُردو بازار کراچی-
۸- پنجاب نیوز ایجنسی اُردو بازار کراچی
۹- کراچی بک ڈپو ۸۴ اُردو بازار کراچی
۱۰- اقبال بک ڈپو سمرسٹ سٹریٹ صدر کراچی
۱۱- مسعود علی رضوی رضوان آباد فیڈرل بی ایریا منصورہ کراچی
۱۲- اتحاد بک ڈپو، گاڑی کھاتا حیدر آباد
۱۳- مکتبہ اسلامی، کورٹ روڈ حیدر آباد
۱۴- رحمان نیوز ایجنسی، شارع فاطمہ جناح کوئٹہ
۱۵- گوشۂ ادب سرکلر روڈ، کوئٹہ
۱۶- مکتبۂ اسلامی معرفت دفتر جماعت اسلامی جیکب آباد
۱۷- مصاحب علی صاحب امیر جماعت اسلامی نواب شاہ
۱۸- عجائب سٹورز (رجسٹرڈ)، فریر روڈ سکھر-
۱۹- مکتبۂ تعمیر ملت ڈہرکی ضلع سکھر
۲۰- ملت بک ڈپو ریلوے روڈ رحیم یار خاں
۲۱- عزیز اینڈ سنز شاہی بازار لاڑکانہ
۲۲- امداد علی قادری مکتبہ اسلامی قنبر علی خان
۲۳- مکتبۂ احیائے ملت کپ بازار ملتان
۲۴- ضیا بک ڈپو، چمن بازار ہارون آباد
۲۵- قاری محمد عبداللہ صاحب مسجد گول چوک اوکاڑہ
۲۶- لال دین سلیم امیر جماعت اسلامی، لائل پور
۲۷- حاجی دین محمد صاحب ماموں کانجن
۲۸- ادارۂ امتیاز کمالیہ
۲۹- شاہین پبلیکیشنز، راجن پور
۳۰- خان زمان خاں اینڈ کو، غلہ منڈی سرگودھا-
۳۱- محمد اسحاق ناصر، ریلوے روڈ سیالکوٹ
۳۲- چوہدری راجولی صاحب مشین محلہ جہلم،
۳۳- مولوی غلام رسول صاحب منڈی بہاء الدین
۳۴- مکتبہ افکار اسلامی ۲۴ بازار تلواڑاں راولپنڈی-
۳۵- تاج کمپنی لمیٹڈ، لیاقت روڈ، راولپنڈی
۳۶- مکتبہ اسلامیہ منڈی بازار لالہ موسیٰ
۳۷- عبدالعزیز دوکان ۵ ۲۱ ایریا مارکیٹ واہ کینٹ
۳۸- شیخ سعید احمد خاکسار مارکیٹ فاروق جنرل سٹور ڈی جی خان
۳۹- خواجہ محمد یونس کندسکوٹ-
۴۰- حکیم محمد اسحاق حویلیاں (۱۴) فیض محمد سری پور ہزارہ
۴۲- ضیاء بکڈپو بازار شہیداں ہوتی- مردان
۴۳- شوکت کریانہ سٹور، مانسہرہ
۴۴- مکتبہ اسلامی، بنک روڈ، مردان،
۴۵- عزیزیہ کتب خانہ چوک صرافہ بازار ڈیرہ اسمٰعیل خان
۴۶- عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد خیلاں بنوں شہر
۴۷- ضیاء بک ڈپو نیو روڈ منگورہ